دو آوازیں
اثر ناپید یتیم

# دو آوازیں

ایک ناول

امرتا پریتم
۲
دو آوازیں

مترجم: مخمور جالندھری

سٹار پاکٹ سیریز نمبر ۴۹
ناشر: سٹار پبلیکیشنز ۔ ۲۷۱۵ ۔ دریا گنج ۔ دہلی ۶
قیمت: صرف 2.57 روپیہ
سول ایجنٹ: پنجابی پستک بھنڈار دریبہ کلاں دہلی ۶

اندھیرے کی اس کوکھ کے نام
جس سے کبھی کبھی کوئی چیز چمک اُٹھتی ہے

(۱)

زینب بی بی قمیص کے گھیرے کی کچی سلائی کر بیٹھی تھی اور اب اس پر صرف مشین چلانی رہ گئی تھی۔ "قمیص کے پانچ آنے اور پاجامے کے دو آنے۔" اس نے حساب لگایا ______ ....... اس طرح سات آنے ضرور بن جائیں گے۔ پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی سوئی اس نے دھاگے کی گولی میں لگا دی اور آواز دی ___ "فیض! ___ اُٹھ بیٹا ___ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر چاک چوبند ہو جا ___ ابھی تیرا ماموں تجھے کام پر ___ لے جائے گا ___"

"بھابھی! کیا آج میں مسجد نہیں جاؤں گا ___؟" چھ برس کا فیض محمد ہڑبڑا کر چارپائی پر اُٹھ بیٹھا۔

زینب بی بی نے ایک آہ بھری۔ بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا ___ اس کی ٹھنڈی سانس

کہہ رہی تھی ــــ میں قصور وار ہوں کہ میں نے تجھے مسجد سے اُٹھا لیا۔ لیکن میں کیا کروں ؟" اور بلند آواز میں اُس نے صرف یہ کہا ــ "تیرا ماموں کہہ رہا ہے کہ تجھے آٹھ روپے ماہوار مل جایا کریں گے۔"

تکیہ درویشوں کی مسجد ایک بار فیض کی نگاہوں میں گھوم گئی اور اُس نے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مار کر مسجد کو اپنی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔

(۲)

"یہ رنگ سازی کا کام کچھ نہیں فیض ! تو صبح سویرے جاتا ہے اور رات ڈھلے واپس آتا ہے۔ اور پھر مٹی کے تیل سے بھرے ہوئے تیرے بدن پر سے رنگ اُتارتے ہوئے میرے تو ہاتھ تھک جاتے ہیں ــــ" ایک روز زینب بی بی نے اپنے بیٹے کو نہلاتے ہوئے کہا۔

"بھابھی ــــ اب تو میں ٹرنکوں پر اچھے پھول بنا لیتا ہوں۔" فیض نے اپنے بدن کو موٹے کپڑے سے پونچھا۔

"ٹھیک ہے ۔۔۔ دو برس ہونے کو آئے اور ایک مہینہ کے روپے تو ابھی تک آٹھ ہی ملتے ہیں ۔۔۔" ماں نے کونے میں پڑے ہوئے صابن کے ایک ٹکڑے سے اپنے ہاتھ دھوئے۔
"دوپہر کا کھانا بھی تو وہ کھلا دیتے ہیں ۔" فیض نے قمیض پہنی اور اپنی چھوٹی سی بہن ساجدہ کو گود میں اٹھالیا۔
"درست ہے لیکن رات کو مٹی کے تیل سے نہاتا تو کوئی بات نہ ہوئی ۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کسی سے بات کی ہے ۔ تو خوشنویسی کا کام سیکھ لے ۔"
"کتنے پیسے ملیں گے ۔۔۔؟" فیض نے تیزی سے پوچھا۔
"پاگل کہیں کے ۔۔۔ کبھی کام سیکھتے کے بھی پیسے ملتے ہیں ۔۔۔ کچھ دیر یہ کام سیکھتے رہنا اور پھر وقت آنے پر تجھے پیسے بھی ملیں گے ۔"
"مگر بھابھی! تو گھر کا خرچ کیسے چلائے گی؟" "تجھے کپڑے بھی تو روتے سینے کے لئے نہیں ملتے۔"
"میں نے دو گھروں کا کام لے لیا ہے ۔ اُن کے برتن صاف کر دیا کروں گی تو کام سیکھ لے ۔۔۔" زینب بی بی کے سینے سے اک آہ ملبند ہوئی مگر اس نے منہ پھیر لیا۔ تاکہ اس آہ سے اس کے بیٹے کے قدم ڈگمگا نہ جائیں!۔

"خوشنویسی سیکھنے کے لیے فیض کو بھاٹی دروازے سے دلّی دروازے تک جانا پڑتا تھا۔ وہ دن بھر وہاں رہتا اور جب خالی ہاتھ گھر لوٹتا تو اُس کی ٹانگیں بالکل بے جان ہوتیں۔

ایک دن وہ منہ اندھیرے ہی اُٹھ بیٹھا۔ دلّی دروازہ جانے کے لیے گوال منڈی کی طرف چل پڑا۔ سبزی منڈی میں ترکاریوں سے لدے ہوئے چھکڑے کھڑے تھے۔ سودا بازی ہو رہی تھی اور ٹوکرے بھرے جا رہے تھے۔

کبھی کوئی آلو، کبھی کوئی پیاز اور کبھی کوئی بینگن لڑھکتا ہوا دور جا پڑتا۔ فیض نے دیکھا اور چیزوں کی نسبت یہ گول چیزیں لڑھک پڑتی تھیں۔ اُس نے لپک کر وہ آلو، وہ پیاز اور وہ بینگن چن لیے۔

بازار میں ترکاریوں کی چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں اپنے سامنے رکھ کر کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ذرا ہٹ کر ایک مکان تعمیر ہو رہا تھا۔ کام پر جاتی ہوئی "باگڑنوں" (بیکانیر کی عورتیں) نے سستی سبزی خریدنے کے لیے بھیڑ لگا رکھی تھی۔

فیض نے بھی اپنے حصّے کے آلوؤں اور پیازوں کی ایک ڈھیری لگا دی ___ اپنا تہمد ذرا اوپر کھسکا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔

فیض نے تھوڑی سی دیر میں ڈھائی آنے بنا لئے۔

اب وہ دِلّی دروازے کی طرف بڑھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اُڑ رہا ہو۔

(۴)

کسی روز دو آنے ___ کسی روز ڈھائی آنے ______ یہ فیض کی روزانہ آمدنی ہو گئی۔

جہاں وہ خوشنویسی کا کام سیکھتا تھا وہ ایک اخبار کا دفتر تھا۔ ایک شام کو فیض نے سوچا۔ اگر وہ اخبار کے آٹھ پرچے خرید لے تو وہ چار چار پیسے بک جائیں گے اور اس طرح اُسے آٹھ پیسے بچ جائیں گے۔ اور اس نے ترکاری بیچ کر جو پیسے جمع کئے تھے اُن سے اُس نے روزنامہ "سیاست" کے آٹھ پرچے خرید لئے۔

"تازہ پرچہ آ گیا ___ سیاست کا تازہ پرچہ!"

پہلے ایک بازار میں اور پھر دوسرے بازار میں کھڑے ہو کر وہ بلند آواز سے پکارنے لگا۔

چار پرچے بک گئے۔ لیکن ابھی چار پرچے اس کے ہاتھ میں تھے وہ بازاروں سے گذرتا رہا اور یوں ہی صدا لگاتا رہا ـــــ

شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ اور بچے ہوئے پرچے ابھی تک اُس کے ہاتھ میں ڈھل رہے تھے۔

ہیرامنڈی سے گذرتے ہوئے ایک شخص نے اُس سے کہا ـــ "مجھے اخبار روز دے جایا کرو ـــ" یہی بات اُس سے ایک اور گاہک نے چوک جھنڈے" بھی کہی تھی ـــ

"چوک جھنڈا چاہے کہیں ہے اور ہیرامنڈی کہیں ـــ

پھر بھی دو گاہک تو میرے پکے ہو گئے۔ یعنی روز کے دو پیسے پکے ـــ" اگر یہ بچے ہوئے اخبار فروخت نہ ہوئے تو پھر؟ نیفن نے حساب لگایا۔ "چھ پیسے اپنی گرہ سے جائیں گے ـــ"

شام کے سائے اور بھی گہرے ہو گئے ـــ اُس نے انارکلی کے چوک میں کھڑے ہو کر بچے ہوئے پرچے تین تین پیسوں ہی میں فروخت کر دیئے۔

---

(۵)

"تازہ پرچہ آ گیا ــ سیاست کا تازہ پرچہ!" ہیرا منڈی میں کھڑے ہو کر فیض نے صدا لگائی۔ لیکن اس کی آواز اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ ایک مکان سے گانے کی آواز آ رہی تھی ــ

یہ دُعا ہے آتشِ عشق میں تو مری طرح سے جلا کرے
نہ نصیب ہو تجھے بیٹھنا ترے دل میں درد اُٹھا کرے

نومبر کا مہینہ دھیرے دھیرے دسمبر کے مہینے میں ڈھلتا جا رہا تھا۔ سردی فیض کے پیروں سے ہوتی ہوئی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی اور سردی کی کپکپی جیسا ایک خیال اس کے دماغ سے گزرا ــ "یہ تو میرے ابا کی غزل ہے ــ میرے ابا کی غزل ــ شاید میرے ابا بھی اندر بیٹھے ہیں ــ یہ گانے والی شاید اُن کے سامنے بیٹھ کر اُن کی غزل گا رہی ہے ــ"

فیض کے والد شہر ہی رہتے تھے۔ کٹڑہ ولی شاہ میں۔ فیض اگرچہ اس وقت پانچ برس کا تھا۔ جب اُس کی ماں اُسے اور اپنی بیٹی ساجی کو لے کر کھائی دروازہ

ہیں اپنے بھائی کے گھر چلی آئی تھی ـــــ لیکن فیض کو اپنے والد کا گھر اچھی طرح یاد تھا ـــــ اُسے ان چند غزلوں کا بھی پتہ تھا جو اُس کے والد نے کہی تھیں۔

"میری ماں کا کیا قصور تھا؟" فیض سوچنے لگا۔ وہ اگرچہ ابھی نوعمر تھا لیکن اُس کی سوچ جوان ہو رہی تھی۔

"میری ماں کا یہی قصور تھا کہ وہ بہت سیدھے سادے خدوخال والی عورت تھی ـــــ" فیض کے ہونٹوں پر بل پڑ گئے "وہ میرے باپ کے رنگین معیار کے تصور پر پوری نہ اُتری۔"

"ولایت بیگم ـــــ" فیض اخبار بیچنا بھول گیا۔ وہ سوچنے لگا ـــــ لوگ کہتے ہیں۔ وہ بہت اچھا گاتی ہے اور میرے والد صاحب اس کے لئے غزلیں کہتے ہیں ـــــ" یہ باتیں اس نے سن رکھی تھیں۔ مگر فیض اتنا جانتا تھا کہ ولایت بیگم عید کے دن میٹھا اور بقرعید کے دن نمکین پلاؤ اُن کے گھر ضرور بھیجا کرتی تھی اور اس کے والد صاحب غزل میں ولایت کا نام بھی ضرور لکھا کرتے تھے۔

سامنے کے مکان سے ابھی تک آواز آ رہی تھی۔

یہ دُعا ہے آتشِ عشق میں تو مری طرح ... جلا کرے
نہ نصیب ہو تجھے بیٹھنا ترے دل میں درد اُٹھا کرے

فیض نے اپنے حلق کا پورا زور لگا کر آواز بلند کی ۔ "تازہ

پرچہ آگیا۔ سیاست کا تازہ پرچہ —" شاید وہ سوچ رہا تھا! ۔
" دیکھتا ہوں غزل کا مطلع زیادہ بلند اُٹھتا ہے کہ اخبار
کا یہ نعرہ!"

(۶)

کل انارکلی کے چوک میں بکے ہوئے اخبار اُس نے پھر تین
تین پیسوں میں بیچ ڈالے تھے۔ اور قریب کھڑے ہوئے اخبار
بیچنے والے پور بیئے اُس سے رطڑ پڑے تھے۔

آج شام کے سائے اگرچہ گہرے ہو گئے تھے۔ مگر پوربیوں
کے جھگڑے سے ڈرتا ہوا فیض انارکلی کے چوک میں نہ آیا۔ آج
اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ کتنی دیر کیوں نہ ہو جائے میں سارے
اخبار پوری قیمت پر فروخت کروں گا۔

" تازہ پرچہ آگیا۔ سیاست کا تازہ پرچہ —" یہ آواز
بلند کرتے ہوئے فیض نے اس مشہور مقدمہ قتل کی سُرخی پڑھی
جو ان دنوں چل رہا تھا۔

اس کے ہاتھ میں اخبار پرچم کی طرح لہرا رہا تھا۔ اس
کی آواز میں قتل کے مقدمہ کا حال تھا۔ تیز تیز چلتے ہوئے اسکے

قدم ٹھٹھک گئے۔ سامنے کالی شیروانی زیب تن کئے اس کے والد آرہے تھے۔

"اس بازار میں اور ہیرا منڈی میں میرے والد بہت مشہور ہیں ___ ہر ایک گانے والی اُن کا نام جانتی ہے۔ ہر ایک گانے والی اُن سے نئی غزل حاصل کرنے کے لئے اُنہیں سلام کرتی ہے ___ اپنے بیٹے کو وہ اخبار بیچتا ہوا دیکھیں گے ___ اُن کی عزت کو دھکا لگے گا ___ نہیں نہیں مجھے کہیں چھُپ جانا چاہیئے ___" فیض سوچنے لگا۔

پھُرتی سے اُس نے دونوں طرف دیکھا ___ سڑک کی آغوش کھلی تھی ___ کہیں کوئی آڑ نہ تھی۔ اس میں اور اس کے والد کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ بائیں طرف سڑک کے کنارے بجلی کا ایک کھمبا نزدیک ہی تھا۔ جوں جوں اس کے والد اس کے نزدیک آتے گئے توں توں وہ اپنا پہلو بدلتا رہا۔

پھر اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ چونکہ اُس کے والد نے اُسے دیکھا نہیں تھا۔

اُس کے ابا ایک مکان کی سیڑھیاں چڑھ گئے تو فیض کھمبے کے پیچھے سے نکل کر سڑک پر ہولیا۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں اخبار پرچم کی طرح لہرا رہا تھا ___ اس کی

آواز میں مقدمہ کا حال تھا۔

بجروں کی منڈی سے گزرتے ہوئے فیض نے دیکھا بیوپاری اپنے مال پر نشان لگا رہے تھے۔ کوئی اپنی بھیڑ کی پیشانی پر سُرخ رنگ لگا دیتا۔ کوئی اپنی بھیڑوں کے بدن پر گول گول بینریاں بنا دیتا۔ اور کوئی اپنی بھیڑوں کے بالوں میں سے کچھ بال کاٹ دیتا۔

بھیڑوں کی اون جگہ جگہ گری پڑی تھی۔ فیض نے ہاتھ میں تھامے ہوئے اخباروں کی طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھتا ہوا صدا دینے لگا۔

"تازہ پرچہ آگیا۔"

جب اندھیرا خوب گہرا ہوگیا تو فیض بکروں کی منڈی کی طرف مڑا۔ بھیڑیں تو باڑے میں جا چکی تھیں مگر خالی جگہ پر اُن کے بال پڑے تھے۔

جس طرح کوئی ہاتھ سے گوبر صاف کرتا ہے یا ریل کی پٹڑی پر کوئلہ چنتا ہے۔ فیض نے بھیڑوں کے بال جمع کیے۔

"بھابی، کیا تم انھیں کات سکوگی؟" رات کو گھر جا کے فیض نے بھیڑوں کی ساری اون ماں کے آگے رکھ دی۔

دوسرے دن ماں نے دو چرخے بچھائے۔ ایک زندگی کا چرخہ اور دوسرا لکڑی کا۔ دل کے تکلے پر دُکھ کی ڈور کھینچی۔ اور لوہے کے تکلے پر اون کی لچھی اُتاری نہیں۔ مگر کان دونوں چرخوں کی گھوں گھوں سُن رہے تھے۔

---

(۱)

"اُستاد جی !" دروازے کے باہر سے ایک آواز آئی۔

"فیض ذرا دیکھنا باہر کون ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاج صاحب ہوں۔ تیرے والد" اُستاد غلام فرید نے ہاتھ سے قلم ایک طرف رکھ دیا اور اپنے شاگرد کی طرف دیکھا۔

"کہاں ہو اُستاد جی۔" تاج صاحب دہلیز پار کر کے اندر آگئے۔

"آئیے تاج صاحب۔" اُستاد جی نے دائیں طرف پڑے ہوئے تکیے کو ذرا آگے کھسکا دیا اور پھر کہا۔ "یہ فیض ہے فیض مجدد، اپنا بیٹا۔"

تاج صاحب نے فیض کے چہرے کی طرف دیکھا اور کتنی دیر تک دیکھتے رہے۔ اُن کے ہاتھ جیسے جھجک رہے تھے۔ پھر اُن کی رگوں کے لہو نے جوش مارا۔ ہاتھوں میں طاقت آگئی اور انہوں نے فیض کی پیٹھ تھپک دی۔

"بہت عقلمند بیٹا ہے۔ بڑا ہونہار۔" اُستاد غلام فرید

بولے ۔ پھر اُنھیں یوں محسوس ہوا جیسے تاج صاحب نے اُن کی بات سُنی ہی نہیں تھی ۔ اُن کی آنکھیں ابھی تک اپنے بیٹے پر جمی ہوئی تھیں ۔ اُستاد جی پھر بولے ۔ "دو برس تک میرے ساتھ یہ سیاست کے دفتر میں بھی بیٹھا کرتا تھا ۔ اور جب میں اپنی اس بیٹھک میں کام کرنے لگا تو یہ بھی میرے ساتھ یہاں چلا آیا ۔ کافی مہارت حاصل کرلی ہے ۔ ہاتھ بہت صاف ہو گیا ہے ۔ دیکھو تو سہی کتنا اچّھا لکھتا ہے ۔" اور پھر اُنھیں ایک اور بات یاد آگئی ۔ وہ فوراً بول اُٹھے ۔ "پہلے پہل تو برکت علی کا نام دو نقطی قاف سے لکھا کرتا تھا ۔ لیکن اب تو اس کے ہجّے بہت اچھے ہوگئے ہیں ۔" اور انہوں نے یہ بھی کہا ۔ "اب تو مہینے میں پندرہ بیس روپے بھی کما لیتا ہوں ۔"

تاج صاحب بیٹھ گئے ۔ انہوں نے تکیہ کے ساتھ پیٹھ لگادی اور بولے ۔ "بات یہ ہے اُستاد جی کہ میں ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنا چاہتا ہوں اور اس کی کتابت کا کام آپ کو کرنا ہوگا ۔ میں کسی اور سے کتابت کروانا نہیں چاہتا"

"آپ مالک ہیں ۔ آپ جیسے کہیں گے وہی ہوگا ۔"

"تو پھر بات پکی ہوگئی ۔"

"آپ کا کہا ہم کہاں ٹال سکتے ہیں تاج صاحب"

تاج صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ وہ اپنے بیٹے فیض کو دیکھنے

لگے۔ اور بولے ۔ " اسے اپنے ساتھ لے آنا استاد جی!"
"جیسے آپ کا حکم ہو ۔"
"یہ وہیں رہے گا۔" تاج صاحب بولے اور باہر جانے لگے
"تو تم آ جائے گا نا۔" وہ دہلیز میں رک گئے۔
فیض نے حامی نہ بھری ـــــ مگر انکار بھی نہ کیا۔ تاج صاحب ایک لمحہ کے لئے کھڑے رہے اور پھر کہنے لگے ۔ "اپنی والدہ کو بھی اپنے ساتھ لے آنا ۔" اور پھر انہوں نے جواب کا انتظار نہ کیا۔ کمرے سے باہر چلے گئے۔

(۲)

"تیرا کہا تو میں نہیں ٹال سکتی فیض مگر......"
"بھابی اگر تیرا جی نہیں چاہتا تو نہ سہی ۔"
"یہ بات نہیں ہے فیض ـــــ یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ تیرے والد نے مجھے یاد کیا ہے مگر......... ڈرتی ہوں کہ میرے نصیب مجھ سے پھر کوئی فریب نہ کریں ۔" زینب بی بی نے کہا اور سرد آہ بھر کر اپنے کپڑے سمیٹ لئے اور اپنی بیٹی ساجدہ کو گود میں اٹھا لیا۔

تاج صاحب کے مکان کا نقشہ ہی تبدیل ہو گیا۔ باہر کی بڑی نشست گاہ ہفتہ وار اخبار کا دفتر بن گئی اور اندر کے دو چھوٹے کمرے رہائش گاہ کا کام دینے لگے۔ باہر فیض اپنے اُستاد صاحب کے ساتھ مل کر کتابت کرتا اور اندر بی بی زینب کھانے پکانے کا انتظام کرتی۔

"ڈرتی ہوں کہ میرے نصیب مجھے پھر کوئی دھوکا نہ دیں۔"

چند مہینوں کے بعد ہی زینب بی بی کا یہ خوف حقیقت میں تبدیل ہو گیا۔ تاج صاحب گزشتہ پندرہ روز سے علی پور گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں اُن کے ہمراہ ایک اور عورت تھی۔

(۳)

پچھلے کچھ دنوں سے تاج صاحب کا ایک دوست شہر میں آیا تھا۔ کبھی کبھی وہ تاج صاحب کی نشست گاہ میں آ بیٹھتا تھا ایک دن وہ آیا تو تاج صاحب باہر گئے ہوئے تھے۔ اُس نے بیکار بیٹھے ہوئے ہاتھ میں پنسل پکڑی اور سامنے پڑے ہوئے سفید کاغذ پر ایک عورت کا اسکیچ بنا دیا۔ یہ ایک یکطرفہ پروفائل تھا۔

فیض نے اُسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا ۔ "دو منٹ تک لکیریں کھینچیں اور ایک چہرہ بن گیا ۔" آج اس کے من کے ساگر میں ایک لہر آٹھی ۔

والد صاحب کا وہ دوست چلا گیا! اور اس کاغذ کو وہیں پھینک گیا جیسے وہ کوئی بڑی بات نہیں تھی ۔ فیض نے حیران ہو کر وہ کاغذ اٹھا لیا ۔ ایک بار اُس کو ٹریس کیا ۔ دو بار کیا اور پھر کئی بار کیا اور پھر اُس کا جی چاہا کہ وہ اسے ٹریس نہ کرے ۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر خود ویسی ہی تصویر بنائے ۔

(۴)

"میں نے تجھ سے کہا تھا نا فیض ۔" ایک دن زینب بی بی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ۔

"ہاں بھابی ۔" فیض اب کچھ کہہ نہیں سکتا تھا ۔

"اس گھر میں زیادہ دیر تک میرا دانہ پانی نہیں رہے گا ۔"

"تو پھر چلو ۔ بھائی دروازہ ، ماموں کے گھر چلے چلتے ہیں ۔"

"تجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہو گی ؟"

"مجھے بھلا کیا تکلیف ہوگی ؟ اب میں تمہیں کسی کے گھر کام کرنے کے لئے بھی نہیں جانے دوں گا ۔ میں مہینے بھر میں بیس روپے تو ضرور پیدا کر لوں گا ۔"

زینب بی بی نے اپنے وہی کپڑے پھر لئے جو وہ بھاٹی دروازے سے آتے ہوئے اپنے ساتھ سمیٹ کر لائی تھی۔

کٹڑہ ولی شاہ سے روانہ ہوتے ہوئے فیض کے ہاتھ میں وہ کاغذ بھی تھا جسے کئی دنوں سے وہ سامنے رکھ کر دیکھتا رہا تھا اور اس کی نقل اتارتا رہا تھا۔

## (۵)

اب زینب بی بی نے دوسرے لوگوں کے گھر جا کر برتن صاف کرنے چھوڑ دیئے ۔ اگر کوئی گوٹہ کنارا لگوانے آتا تو لگا دیتی ۔ وہ جھالر نہایت اچھی بنتی تھی ۔ اگر باریک زری کی کاڑھنی ہوتی تو وہ بھی کاڑھ دیتی ۔

فیض کو "شیراں والے" دروازے کے باہر ایک ہفتہ وار اخبار "کشمیری" میں ملازمت مل گئی ۔ پندرہ روپے ماہوار پر۔ ان دنوں فیض کو لکھنے کے دو شوق ہو گئے تھے ۔ ایک

شوق تو یہ تھا کہ وہ دن کو ہاتھ میں پنسل پکڑتا اور کاغذ پر کوئی نہ کوئی چہرہ بناتا رہتا۔ رات کو ہاتھ میں چاک لیتا اور سبز دروازوں کے تختوں پر کوئی نہ کوئی تصویر بناتا رہتا۔ اور اس کا دوسرا شوق یہ تھا کہ وہ کوئی گیت سنتا۔ ......... تو اس کی دُھن اس کے دل میں اتر جاتی۔ پھر جہاں وہ بیٹھتا اُس کے ہونٹ ہلتے رہتے، وہی دُھن ہوتی ــــ وہی بول ہوتے۔ آج کل جب بھی اُسے فرصت ہوتی تو کوئی پنسل یا چاک خود بخود اس کے ہاتھ میں آجاتا ــــ اور ایک گیت خود بخود اُس کے ہونٹوں پر آجاتا۔ بھلا عزور نہ کر خاک میں ملا کے مجھے۔

(۶)

لوہاری دروازے کے ایک کتب فروش نے ایک دن فیض کا کام دیکھا۔ آج کل فیض کے باطن میں کوئی نہ کوئی چیز پروان چڑھتی رہتی تھی ــ کوئی نہ کوئی چیز کھلتی رہتی تھی۔ وہ اچھی سے اچھی کتابت کرتا۔ لیکن اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کے باطن میں کسمساتا ہوا بہت کچھ اِن حروف میں پوری طرح نہیں سماتا تھا۔ وہ کسی سُرخی کے اوپر پھولوں کی بیل بنا دیتا اور کسی کے ساتھ پھول بنا دیتا تھا۔

"کہاں کام کرتے ہو بیٹا؟" ۔ کتب فروش نے پوچھا۔
"ہفتہ وار کشمیری میں۔"
"کتنے روپے ملتے ہیں؟"
"پندرہ۔"
"تو کیا میرے یہاں آجائے گا؟ آغاز میں تیس روپے دیدوں گا۔ تیرے کام کے مقابلہ میں تیس روپے کچھ نہیں ہیں مگر ........"
"ایک ہی دن میں میری تنخواہ دگنی ہو گئی۔" فیض کے سینے میں اُگتے ہوئے گل بوٹوں پر جیسے کسی نے پانی چھڑک دیا۔
"بھابی ۔ بھابی ۔" گھر جا کر فیض اپنی ماں سے بغلگیر ہو گیا "مجھے تیس روپے کی ملازمت مل گئی ہے۔" فیض نے مچلتے ہوئے کہا۔
"سچ۔" ماں کے ہاتھ سے سوئی گر پڑی۔
جو گل بوٹے فیض کے سینے میں اُگے تھے اُن کی کچھ کلیاں ماں کے دل میں بھی چٹک رہی تھیں۔ وہ بولی ۔ "مزار داتا گنج بخش کے پچھواڑے تیرے ماموں نے مجھے تین مرلے زمین لے دی ہے۔ مجھے اُمید تو نہیں تھی کہ میں کبھی وہاں مکان تعمیر کرا دوں گی۔ لیکن ......" ماں نے دوپٹے کے کنارے سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا ۔ "تیری تنخواہ تیس روپے ہو گئی ہے۔ اسباب

میں کمیٹی ڈال دوں گی۔ اور جب کمیٹی نکلے گی تو ہم اپنے مکان کی بنیاد رکھ دیں گے۔ تیرا ماموں بھی کچھ ہماری مدد کرے گا۔"

(۷)

فیض کے دونوں شوق جیسے ندی کے دو کنارے تھے۔ فیض کا دل اِن دو کناروں میں محفوظ اور گھرا ہوا بہہ رہا تھا۔ فیض کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ایک جسم کے دو بازو ہوں اور وہ ان بازوؤں کی گرفت میں جکڑا ہوا ہو۔

آج وہ کہیں ایک اشتہار پڑھ آیا تھا کہ جالندھر میں بابا ہری ولبھ کا میلہ ہو رہا ہے۔ وہاں ہندوستان بھر کے مشہور گویے آئینگے پورے تین دن یہ محفل گرم رہے گی۔

فیض کے پاؤں تو دہیں رُکے رہے تھے لیکن اس کے کان جالندھر چل پڑے تھے۔ اس کے کانوں میں کئی سُر اور کئی ساز چھیڑے ہوئے تھے۔

فیض نے جیب میں کچھ پیسے ڈالے۔ کندھے پر گلوبند رکھا اور ہاتھ میں ایک کمبل پکڑ لیا۔ یہ دن کڑاکے کی سردی کے تھے۔

موسیقی کی محفل صبح آٹھ بجے منعقد ہونے والی تھی - فیض جب پہنچا تو اُسے زیادہ دیر نہیں ہوئی - لیکن پنڈال میں تِل دھرنے کی جگہ نہیں تھی - فیض کی ٹانگیں کلبلا رہی تھیں ـــ پیچھے بیٹھنا اُسے کچھ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا ـــ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سب شیدائیوں کی نسبت آگے بیٹھنے کا اُسے کچھ زیادہ ہی حق حاصل تھا - اُس کے کانوں کو سب سے زیادہ پیاس لگی ہوئی تھی - وہ کتنی دور سے چل کر آیا تھا ـــ اُس نے دیکھا کہ لوگوں کو اس کا یہ حق تسلیم کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی - ہر طرف آپا دھاپی پڑی ہوئی تھی اور جس جگہ جو کوئی بیٹھا تھا وہاں اُسے حقہ دار بنانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا -

یہ دن فیض نے جیسے تیسے دور بیٹھ کر ہی گذار لیا - لیکن اگلی صبح کو ابھی ساڑھے پانچ ہی بجے تھے کہ اُس نے اپنے کانوں پر گلوبند اور اپنے گرد کمبل لپیٹا اور خالی پنڈال میں سب سے آگے جگہ گھیر کر بیٹھ گیا -

صبح آٹھ بجے سے دوپہر کے ایک بجے تک اور شام کو آٹھ بجے سے رات کے ایک بجے تک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں کے ایک جنگل میں گم ہو گیا تھا - ہر ایک سانس کے ساتھ اُس نے اپنی روح میں خوشبو بھر لی -

محفل ختم ہو گئی - وہ اپنے شہر واپس آ گیا لیکن اُسے ایسا

محسوس ہوتا تھا کہ جب وہ سوتا تھا تو اُس کے چاروں طرف ایک محفل منعقد ہو جاتی تھی۔

وہ سویا پڑا تھا اور محفل گرم تھی۔ نرائن راؤ ویاس گا رہا تھا۔ پھر سورج کی دھوپ نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھا دیا اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی محفل نغمہ وسرود نہیں تھی۔ لیکن کانوں میں نارائن ویاس کی آواز بدستور آرہی تھی۔ "ادھے کرشن بول مکھ سے۔" اپنا وہم دُور کرنے کے لئے اُس نے چلو میں پانی لیا اور مُنھ پر چھینٹے مارے۔ اب وہ کھڑکی سے دور تھا۔ آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔ پھر وہ اپنا منھ پونچھتا ہوا کھڑکی کی طرف آیا۔ آواز اور بھی بلند ہو گئی۔

فیض نے بھید پا لیا۔ اُس کے پڑوسی لالہ یعقوب کے گھر نارائن راؤ ویاس کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ "میں گراموفون خریدوں گا۔" اس کے عشق نے ہر گھڑی اپنے محبوب کی آواز سن سکنے کا بھید پا لیا

(۸)

ایک روز فیض کو تیس روپے ماہوار دینے والے کتب فروش

نے کہا کہ یہ تیس روپے اس کام کی قیمت نہیں تھے اگر وہ چاہے تو بڑی بے تکلفی سے باہر کا کام بھی لے آیا کرے۔ اگر افسر کا جی چاہے تو نوکری بھی چھوڑ دے۔ وہ ہر مہینے اُسے تیس روپے سے زیادہ کا کام دیا کرے گا۔

فیض نے اسکی بات پر عمل کیا۔ نہ جانے وہ اپنا کام کس محنت سے کرنے لگا کہ ہر جگہ اُس کی مانگ بڑھ گئی۔ اب اُسے ہر مہینے پچاس یا پچپن روپے کی آمدنی ہونے لگی اور کبھی کبھی ساٹھ روپے بھی بن جاتے۔

اُس کی مانگ بڑھی تو اُس کے ساتھیوں کی رقابت میں بھی اضافہ ہوا۔

"ہم یہ کام کرتے ہوئے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ لیکن جو کوئی بھی آتا ہے اس کل کے لونڈے کو پوچھتا ہے۔"

فیض اپنے ساتھیوں کے دبی زبان میں یہ طعنے سنتا اور سوچتا ۔ ۔ میں نے اگر اتنی عداوت سہیڑلی تو میں کوئی اچھا کام نہیں کروں گا۔"

اس نے لوہاری دروازہ چھوڑ دیا جو کتابت کے کام کا مرکز تھا۔

اس نے بھاٹی دروازہ میں ایک بیٹھک کرایہ پر لے لی۔

"جن لوگوں کو میرے کام کی ضرورت ہو گی وہ یہاں بھی پہنچ

جائیں گے۔ لوگ بڑے ہنر شناس ہوتے ہیں۔" اُس نے سوچا۔

اور اس نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ اس کے قدر دان وہاں بھی پہنچنے لگے۔

(۹)

زینب بی بی نے مکان تعمیر کروانا شروع کر دیا۔ آج کل نیفں کو یوں نظر آتا تھا جیسے اس کے دل میں بھی کوئی محل تعمیر ہو رہا تھا۔

اس کی بیٹھک کے قریب دو آرٹسٹوں کا سٹوڈیو تھا ایک شراکت دار کا نام تھا اے آر کاردار اور دوسرے کا نام تھا ایم اسمٰعیل۔ ایک نے اپنے نام کے دو حروف اے آر اور دوسرے نے اپنے نام کے حروف ایم۔ای لیکر سٹوڈیو کا نام "آرمی سٹوڈیو" رکھا تھا۔ یہ دونوں آرٹسٹ مل کر سینما کے پوسٹر بناتے تھے۔ جہاں کہیں بھی اِن کا پوسٹر چسپاں ہوتا۔ نیفں وہیں کھڑا ہو جاتا اور کتنی دیر تک اُسے دیکھتا رہتا۔

تھوڑے ہی دنوں میں مکان تعمیر ہو گیا۔ زینب بی بی نے

پانی سے کورا مٹکا بھرا، ہاتھ میں قرآن مجید لیا اور اس مکان میں قدم رکھا۔

نیفی نے سُنا کر اُس کے پڑوسی آرٹسٹ بمبئی چلے گئے تھے وہاں کوئی فلم "ہیر رانجھا" تیار کر رہا تھا۔ سلوچنا کو ہیر کا پارٹ ادا کرنا تھا اور بلیمور یا رانجھا بنے گا۔ نیفی کے پڑوسی آرٹسٹوں میں سے ایک آرٹسٹ نے "کیدو" کا رول ادا کرنا تھا اور دوسرے نے "سیدے" کا۔ نیفی نے یہ بھی سُنا کہ اب لاہور میں سینما کے پوسٹر بنانے والا کوئی آرٹسٹ نہیں تھا۔ کتنے دنوں سے نیفی کے دل میں جو تصوّر کا محل اُبھر رہا تھا۔ نیفی کو اب معلوم ہوا کہ اب اسے حقیقت میں تبدیل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

"مجھ جیسا خوشنویس کون ہو گا۔ صرف ڈرائنگ والی بات ذرا مشکل ہے۔" نیفی سوچنے لگا۔ اس نے ایک حل ڈھونڈا "ڈرائنگ کسی آرٹسٹ سے کروا لیا کروں گا۔"

نیفی نے ایک پوسٹر بنایا۔ دوسرا پوسٹر بنایا اور پھر اُسے کئی پوسٹر تیار کرنے کا آرڈر مل گیا۔

"یہ ڈرائنگ کسی سے کروانا بہت بڑی مجبوری ہے۔ دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔" ایک دن نیفی نے سوچا "چھوٹا موٹا اسکیچ تو میں خود ہی بنا لوں۔ مگر اس چھوٹے اسکیچ کو بڑا کیسے بناؤں؟"

اُس نے کاغذ پر چورس خانے بنائے۔ اسی اسکیل سے سارے آرٹسٹ چھوٹی تصویروں کو بڑا بنالیتے ہیں۔!

فیض نے سوچا۔ اور پھر اس کا جی نہ مانا۔

"یہ نہیں۔ میں کوئی اور حل تلاش کروں گا ـــــ کوئی نیا حل۔ مہنگا بھی نہ ہو اور درست بھی ہو۔"

اور پندرہ دن کی محنت ہی سے فیض نے وہ حل تلاش کرلیا۔

"اب تو میں چڑیا جتنی چیز کو ہاتھی جتنی بڑی بنا سکتا ہوں" فیض نے اطمینان کا سانس لیا۔

(۱۵)

ایک روز کسی نے اس کی بیٹھک کے دروازہ پر دستک دی۔

"کیا یہ فیض صاحب کی بیٹھک ہے۔" باہر ایک بزرگ کھڑے تھے۔

"جی ہاں۔ تشریف لائیے۔" فیض نے کہا۔

آنے والا شخص نے اندر آکر بیٹھک کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور پھر اس نے بڑے اطمینان سے اپنے سر کو جنبش دے کر کہا۔ "ہاں یہ بیٹھک فیض صاحب کی ہے۔ میں بڑی دیر تک اس بیٹھک کو ڈھونڈتا رہا ـــ" کمرے میں چار سو بکھرے

ہوئے رنگ اور کاغذ اِس بزرگ کو یہ یقین دلا رہے تھے کہ مطلوبہ
بیٹھک انہوں نے واقعی ڈھونڈ لی تھی۔

"تشریف رکھئے۔" فیض نے کہا۔

"فیض صاحب کب آئیں گے ــ" انہوں نے دری پر بیٹھ
کر دیوار سے پیٹھ لگا دی۔

فیض مسکرایا۔

"کیا دیر سے آئیں گے۔؟"

"نہیں، نہیں آپ بیٹھیے اور فرمائیے۔"

"مجھے اُن سے کوئی کام نہیں ہے۔ صرف ایک منٹ کے لئے
اُن کا دیدار کرنا ہے۔"

فیض کے نو عمر چہرے پر نیا نیا شباب شرما گیا! ور اس
نے آہستہ سے کہا۔ "میرا نام ہی فیض ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ میری مراد پوسٹر بنانے والے فیض صاحب
سے ہے۔"

وہ بزرگ مسکرائے اور پھر باہر کی طرف اشارہ کر کے کہنے
لگے ــ "وہ سامنے کی دیوار پر ایک پوسٹر لگا ہوا ہے۔ یہ
پوسٹر جن کا بنایا ہوا ہے۔ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ پوسٹر میں نے ہی بنایا ہے ــ" فیض کی آواز میں
جھجک بھی تھی اور اطمینان بھی تھا۔

"تم نے ــ" وہ بزرگ چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ فیض کے

کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے ۔"میں تو سمجھا تھا کوئی معمّر سے بھی زیادہ معمّر شخص ہوگا ۔ اس کے سر کے بال ہی نہیں اس کی بھویں بھی سفید ہوں گی ۔"

فیض کی مسیں پھوٹ رہی تھیں ۔ کالی مونچھ چمک اٹھی ۔

" ساٹھ اِنچ کا پوسٹر ۔۔۔۔ پوسٹر جتنا تمہارا قد ہوگا ۔"

اِس بزرگ نے فیض کی پیشانی چوم لی ۔ اُس نے دعا دی ۔

"خدا تم پر اپنا کرم کرے ۔ ایک دن تیرے قلم میں جادو ہوگا ۔ "

(۱۱)

"فیض اگر تم میری ایک بات مانو تو ......" ایک دن زینب بی بی نے کہا ۔

"میں نے تیرا حکم کب نہیں مانا بھابی ۔ "

"تم اپنے والد صاحب سے کہو کہ وہ یہاں آجائیں ۔ اپنے گھر ۔ "

"یہاں اپنے گھر ۔ " فیض اپنی ماں کا حکم سن رہا تھا

"تیرا گھر ہوا تو اُن کا گھر بھی ہوا ۔ وہ وہاں کرائے

کے مکان میں رہتے ہیں۔ اور سنا ہے کہ جو عورت وہ علی پور کے عرس سے لائے تھے وہ انھیں چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ وہ اکیلے ہوں گے۔"
فیض نے اپنی آنکھیں جھکا کر کہا۔
"بہت اچھا بھائی ....."، فیض نے کہا اور پھر اپنے آپ سے اس نے کہا۔ "سمندر شاید عورت کے دل جتنا گہرا نہیں ہوتا ہے"
جس نے ساری عمر اپنی بیوی سے یہ نہ پوچھا کہ وہ روکھی سوکھی کھاتی ہے یا بھوکی سو جاتی ہے۔ ساری عمر جان مار کر زینب نے اپنے سر پر ایک چھت ڈالی ہے۔ مگر اب بھی یہ اُس شخص کو پکار رہی ہے .......
"اس شخص کو ............"، فیض کی نانی ماموں اور ممانی نے یہ باتیں کہیں۔ لیکن فیض نے اپنی ماں کا پیغام اپنے ابا کو بھجوا دیا۔

(۱۱)

ایک دن زینب بی بی کے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ "صبح کسی سیانے کو دکھاؤں گی۔" اس نے سوچا اور پھر منہ لپیٹ لیا۔ "کہیں بچے نہ جاگ جائیں۔"

صبح جب فیض اور اس کی بہن ساجی بیدار ہوئے تو ماں کی زبان اکڑی ہوئی تھی۔ بیا نے کو بلوایا گیا مگر نبض تھی کہ ڈوبتی جا رہی تھی۔ "یہ ہیضہ تو ایک گھڑی کی مہلت نہیں دیتا۔" بیا ابھی یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ ماں نے آخری ہچکی لی۔

"ماں کے دم سے ہی یہ شہر آباد تھا ۔۔" فیض نے ایک لمبا سانس لیا۔

گذرنے کو کچھ دن تو گذر گئے مگر فیض کا جی اوب گیا۔

"چار دن کے لئے بمبئی کیوں نہ چلا جاؤں ۔۔۔ لوگ کہتے ہیں بڑا رنگیلا شہر ہے ۔۔" فیض نے دل ہی میں سوچا مگر ساتھ ہی ساتھ اسے یہ بھی خیال آیا ۔۔ "ساجی بہن کا کیا ہوگا۔ اُسے کس کے پاس چھوڑ جاؤں۔" فیض گہری سوچ میں ڈوب گیا اور پھر اس نے ایک راہ نکالی ۔ "والد صاحب سے کیوں نہ کہوں کہ وہ یہاں آجائیں ۔ اِس گھر میں ۔۔ وہاں اکیلے بیٹھے کیا کر رہے ہیں ؟ یہاں ساجی کا خیال رکھیں گے۔"

والد صاحب سے یہ بات فیض نے اس وقت بھی کہی تھی جب اس کی ماں نے اُس سے یہ درخواست کی تھی۔

اس وقت انھوں نے اِس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی ۔ شاید اُن کے ضمیر نے گوارا نہ کیا تھا ۔" فیض سوچ میں پڑ گیا ۔ "اب تو ماں مر گئی ہے جس کے سامنے وہ نادم تھے

اب اُنھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا ۔۔۔ " اور فیض جاکر اپنے والد کو گھر لے آیا۔

ساجی کو ابّا کے حوالے کر کے فیض نے بمبئی کا ٹکٹ لے لیا "لوگ ۔ لوگ ۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ ۔۔۔" فیض نے اس شہر کو زندہ اور زندگی سے دھڑکتا ہوا پایا ۔۔۔۔ اونچی اونچی بڑائیں ۔۔۔ جیسے مکان چل رہے ہوں ۔۔۔ فیض کو چاہیے کوئی کام نہ ہوتا مگر وہ کہیں کی بھی ٹکٹ لے کر ٹرام میں بیٹھ جاتا ۔۔۔ شہر دیکھنے کے لئے ۔۔۔ جب وہ سمندر کی طرف دیکھتا تو اس کا دل بھی لہروں سے بھر جاتا۔

فیض پندرہ روز کے لئے اس شہر میں آیا تھا ۔ اس نے کوئی کام نہ کیا ۔۔۔ لیکن اُس نے اپنے کچھ پوسٹر لوگوں کو دکھائے اور تھوڑا سا یہ اندازہ لگا لیا ۔ "اگر میں اِس شہر میں چلا آؤں تو میں روٹی ضرور پیدا کر سکتا ہوں ۔"

## (۱۳)

فیض جہاں سوتا تھا وہ لاہور شہر ہوا کرتا تھا اور جب نیند آجاتی تو وہی شہر بمبئی بن جاتا ۔

"کاش میں بمبئی جا سکوں۔" فیض سوچتا اور پھر اُس کے تلوؤں میں کھجلی ہونے لگتی۔ "کہتے ہیں تلوؤں میں کھجلی ہو تو آدمی کو سفر در پیش آتا ہے۔" فیض کا دل چاہتا کہ اس کا وہم حقیقت بن جائے۔

بمبئی نے فیض کے دل کی بات بوجھ لی۔ اُسے دعوت موصول ہوئی۔ بمبئی کے ہفتہ وار اخبار "مصوّر" نے اُسے طلب کیا۔ ایم اسمٰعیل نے ایک روز مصوّر کا پرچہ دیکھ کر اُس کے مالک سے کہا تھا۔ "اگر پرچہ ہی نکالنا ہے تو ڈھنگ کا پرچہ نکالو۔ کتابت فیض سے کرداؤ تو پرچہ دیکھ کر مزہ آجائے گا۔" مصوّر کے مالکوں کو یہ بات کھا گئی۔ انہوں نے فیض کو بمبئی آنے کی دعوت بھیج دی۔

فیض نے خط پڑھا۔ نہ تنخواہ پوچھی اور نہ ہی رہنے کے لئے مکان کے بارے میں کچھ دریافت کیا۔ اس نے بمبئی کا ٹکٹ لے لیا۔

(۱۴)

"فیض صاحب، یہ بہت بڑی بات ہے۔" کچھ مہینوں کے بعد کسی اُردو اخبار کے مالک نے فیض سے کہا۔ "تم نے تو

ہمارا دھندا ہی بند کر دیا ہے — ہمیں فلموں کے اشتہار ملنے بند ہو گئے ہیں — اب جو بھی اشتہار ملتا ہے مصوّر کو ملتا ہے — تم نے تو مصوّر کا رنگ روپ ہی بدل دیا ہے۔"

فیض مسکرایا۔

"فیض صاحب سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ یا تو ہمارا بھی کام کر دو یا اُن کا کام کرنا بھی بند کر دو — "

فیض کے چہرے پر مسرّت کی دھوپ کِھل اُٹھی اور اُس نے کہا۔

"میں اُن کا کام تو چھوڑوں گا نہیں۔ کیونکہ انہوں نے مجھے اپنے گھر سے بُلایا ہے اور اپنے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ آپ کا میں احسان مند ہوں کہ آپ نے میری قدر کی ہے۔"

بمبئی شہر کی مٹّی نہ جانے کس قدر زر خیز ہو گئی تھی۔ چند ہی روز میں اُردو کے کئی اخبار نکلنے لگے۔ فیض ان کی کتابت کرتا۔ اخباروں میں چھپنے والی غزلوں کو سجا کر پیش کرتا اور اُن کے لئے "پین ڈرائنگ" بھی کرتا۔

ایک روز ایک اسٹال پر کھڑے ہو کر فیض گنتی کرنے لگا اُردو کے تینتیس اخبار تھے (روزنامے اور ہفتہ وار) جن میں سے ۲۸ اخباروں کے ٹائیٹل فیض کے ہاتھ کے بنے ہوئے تھے

(۱۵)

فیض نے اپنے والد صاحب کا شعر پڑھا۔

پس فنا انھیں یاد آ گئی وفا کوئی
مری لحد پہ جو وہ سر جھکائے بیٹھے ہیں

فیض کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے آبا کو اپنی زینب یاد آ رہی تھی — اس کی اپنی بیوی — اس کے بچوں کی ماں۔ جس کی وفا اس کی عمر جتنی طویل تھی۔ اور آج اُس نے اس کی قبر پر اپنا سر جھکایا ہوا تھا۔

"ہو سکتا ہے میرے والد نے یہ شعر کسی اور کے لئے لکھا ہو" مگر اس حقیقت کو اُس نے اپنے دل کے گوشے سے باہر نہ آنے دیا۔ آج اُس کے دل میں اپنی ماں کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ ماں کی وفا دمک رہی تھی۔ اور اس کا تصور آج صرف یہی بات قبول کر رہا تھا کہ اُس کے باپ کے زنجبیل مزاج نے اس کی ماں کی سادہ وفا کے آگے سر جھکایا ہوا تھا۔

فیض نے سامنے ایک کاغذ رکھ لیا۔ رنگ پھیلائے اور اپنے دل کا سارا تصور اُس کاغذ پر اُتار کر رکھ دیا — ایک قبر — سر جھکائے ہوئے بیٹھا ایک مرد — اور قبر پر گرتے

ہوئے آنسوؤں کے تازہ پھول۔

(۱۶)

"فیض صاحب! سُنا ہے کہ تم منٹو کو جانتے ہو۔ اگر تم اُسے بمبئی بُلا سکو۔ تو پرچہ نکلنے کا مزہ آ جائے۔" ایک دن مصّور کے مالک محمد نذیر نے کہا۔

"بہت اچھا۔ اب کے جب میں لاہور جاؤں گا تو امرتسر جا کر اُس سے ملوں گا۔" فیض نے اقرار کیا۔

"سمندر کی ہوا، مجھے راس نہیں آئے گی۔" منٹو ڈرتا رہا مگر وہ اگلے مہینے بمبئی پہنچ گیا۔

منٹو روز بروز تیکھی سے تیکھی طنز کرتا۔ فیض روز بروز نئی لکیروں سے کام لیتا۔ مصّور کے حسن کی تاب نہیں لائی جاتی تھی اور فیض اپنے دل کے حسن و جمال کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔

اس کے دل میں یہ شعور بیدار ہو رہا تھا۔

"اگر میرا والد مجھے اعلیٰ تعلیم دلوا سکتا....." فیض کے دل میں ایک ارمان کروٹ لے رہا تھا۔ "تو میں نہ جانے اپنے

دل کی آگ کو کیا کیا روپ دے سکتا۔"

"من کی آگ کسی ہنر کی محتاج نہیں ہوتی ۔ وہ علم کی محتاج بھی نہیں ہوتی۔" ایک دن فیض نے اپنے آپ سے کہا۔

آج اس کے ہاتھ اس کے من کی آگ کو آنچ کو برداشت نہیں کر رہے تھے۔

اُس نے کاغذ سامنے رکھا اور ہاتھ میں بُرش پکڑ لیا۔ کاغذ پر وہ اپنے دل کے حکم کا نقش بنانے لگا۔ کچھ گھنٹوں کے بعد اُس نے ذرا دور ہٹ کر اس کاغذ کی طرف دیکھا۔

ایک تلوار تھی ۔ بہت لمبی ۔ اس تلوار کا دستہ کسی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ تلوار کی نوک سے اُس نے بہت سے لوگ تلوار میں پرو رکھے تھے۔ سینکڑوں مزدور اور محنت کش۔ نیچے لہو کے قطرے گر رہے تھے۔

فیض اپنی اِس تخلیق کی طرف دیکھتا رہا۔ "یہ لہو کے قطرے ۔ یہ جھریں۔" اس نے اپنی تخلیق کا یہ نام اپنے دل میں سوچ رکھا تھا۔ اس نے پھر غور سے اپنی تصویر کی طرف دیکھا ۔ یہ تخلیق اس کے فن سے انصاف کر رہی تھی۔ اس نے تصویر کے نیچے عنوان لکھ دیا۔

"دولت کا جنم۔"

---

(۱)

"اگر میں کبھی انگلینڈ جاسکوں......" فیض کے دل میں پینٹنگ کا عشق جنون کی حد چھونے لگا تھا — اُسے معلوم تھا کہ اُس کے پاس انگلینڈ جانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اور وہاں کی انگریزی زبان اُس کے بس کا روگ نہیں تھی — مگر اس کے سپنے یہ کوئی بات نہیں جانتے تھے — "رائل اکیڈمی" اور شہر میں بیک وقت لگی ہوئی اتنی اتنی نمائشیں — اور پھر وہاں کے مصوّر۔ اس کے سپنے تو صرف یہی باتیں جانتے تھے۔

اتنی نمائشوں والی بات اُسے چغتائی صاحب نے بتائی تھی "چغتائی ...... یہ لمبی لمبی عورتیں ...... یہ لمبے لمبے بازو۔ لمبے لمبے ہاتھ ...... یہ کیا بتاتا ہے چغتائی؟" چھوٹی عمر میں فیض نے سوچا تھا۔ لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا۔ وہ چغتائی صاحب کے ہنر کا شیدائی بنتا گیا۔

"تیرے دل میں تیرے فن نے اپنے بیج سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ پھوٹ نکلے ......" ایک دن یہ چغتائی صاحب نے فیض سے کہا تھا اور انہوں نے اس کے دل میں

انگلینڈ جانے کا خواب سمو دیا تھا۔
"انگریزی نہیں آتی تو نہ سہی — میں گونگا بن کر بیٹھا رہوں گا" فیض نے جی میں سوچا — "رنگوں اور لکیروں کو دیکھنے کے لئے آنکھوں کو جو زبان آنی چاہیئے وہ مجھے آتی ہے۔"
"راستے کا کرایہ اور وہاں کا خرچ۔" فیض نے پھر سوچا — "لوگ کہتے ہیں وہاں اگر دیہات میں کپڑے کی پھیری لگائی جائے تو اچھے پیسے بن جاتے ہیں۔" فیض کو یہ خیال بھی آیا۔ مگر اس خیال کو اُس نے دور ہٹا دیا — "نہیں کپڑے کی پھیری نہیں — میں کچھ تصویریں بنا کر اپنے ساتھ لے جاؤں ایسی تصویریں جن میں صرف ہندوستان ہو — مداریوں کے تماشے — بہشتی — نتھ اور بالیاں پہنے ہوئے پنجابی لڑکیاں — لمبے لمبے فرن پہنے ہوئے کشمیری لڑکیاں۔" یہ بات اُس کے جی لگی — "یہ چیزیں اُن لوگوں کے لئے بالکل نئی ہوں گی اور وہ میرے وہاں قیام کا خرچ پورا کر دیں گی — کاش کسی طرح کرایہ بن جائے۔"
آج کل فیض نے ناگپاڑے میں، ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لیا ہوا تھا۔ کمرے میں وہ سوتا، بیٹھتا، کتابت کرتا، ڈرائنگ کرتا اور طانپورہ چھیڑ کر گایا کرتا۔
اس کے ارد گرد یہودی رہتے تھے — یہ سب لوگ سب

نہیں تو سو میں سے ننانوے لوگ پیسے لگا کر تاش کھیلتے تھے" پا نسہ پھینکتے تھے اور سٹّہ کھیلتے تھے۔

"یہ سٹّہ تم کس طرح کھیلتے ہو؟ کتنے پیسے لگانے سے کتنے پیسے بن جاتے ہیں؟" ایک دن فیض نے اپنے پڑوسی لڑکے سے پوچھا۔

پڑوسی لڑکے نے اخبار کھولا اور کہا۔ "یہ دیکھو۔ لکھا ہوا ہے "نیویارک کاٹن۔"

"ہاں۔" فیض نے جواب دیا۔

"پچھلی کلوزنگ 30685۔ آج کی اوپننگ 30683 کتنا فرق ہوا؟۔"

"دو۔"

"آج کی کلوزنگ 30685 اور گزشتہ کلوزنگ کے درمیان کیا فرق ہوا۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"بس آخری ہندسے پہ "سٹّہ" لگتا ہے۔ اوپننگ کا بھی آخری اور کلوزنگ کا بھی آخری۔ اگر صرف اوپننگ یا صرف کلوزنگ کا نمبر بتاؤ تو اُسے سنگل کہتے ہیں۔ اگر دونوں کے دو نمبر بتاؤ تو اسے ڈبل کہتے ہیں۔"

"مگر نمبر کس حساب سے بتایا جاتا ہے؟"

"حساب کوئی نہیں۔ جو تمہارے جی میں آئے بتا دو۔ کل نو تو نمبر ہوتے ہیں۔ کیونکہ دس کے بعد پھر ایک شروع ہو جاتا ہے لہٰذا اگر کسی نمبر پر روپیہ لگانا ہے تو نو میں سے صرف ایک نمبر پر لگانا ہے۔"

"کتنے پیسے لگانے سے کتنے پیسے بن جاتے ہیں۔ اگر نمبر ٹھیک نکل آئے تو؟"

"ایک روپیہ لگاؤ تو نو روپے ملتے ہیں۔ دس لگاؤ تو نوّے روپے۔"

"یہ تو سنگل کے ملتے ہیں۔ ڈبل کے آٹھ سو دس روپے ملتے ہیں۔"

فیض اتنے روپوں کا نام سن کر چکرا گیا — اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ انگلینڈ کا ٹکٹ خرید رہا تھا۔

"مگر میں وہ نمبر کیسے سوچوں جو واقعی نکل آئے؟" فیض نے اپنے آپ سے سوال کیا — "شاید اندھیرے میں تیر نشانے پر جا بیٹھے —" یہ سوچ کر فیض کے ہاتھ پاؤں پھول گئے

"اچھا تو فال نکالتا ہوں —" فیض نے فیصلہ کیا — "کس کتاب سے فال نکالوں؟" وہ پھر سوچنے لگا۔ اس نے اپنے کمرے میں پڑی ہوئی دو چار کتابوں کی طرف دیکھا۔ "خون کے آنسو۔" فیض نے یہ کتاب اٹھا لی — سوچنے لگا — "یہ

کتاب ٹھیک رہے گی — میرے فن کار دل کا یہ کھیل خون کے آنسوؤں سے کم نہیں......"
ایک منٹ کے لئے آنکھیں بند کرکے اُس نے کتاب کھولی — سامنے صفحہ چار تھا — "میں سنگل داؤ لگاؤں گا — اور چار نمبر پر پیسے لگا دوں گا۔" فیض نے فیصلہ کیا۔
اس نے اس نمبر پر ایک چونّی لگا دی — دوسرے دن ہی نمبر نکل آیا — چار — اور فیض کو دو روپے چار آنے مل گئے۔

(۳)

سٹّہ سے فیض کو کچھ پیسے ملے۔ مگر ان تھوڑے سے پیسوں نے ایک بہت بڑا وہم عطا کر دیا — درست نمبر تلاش کرنے کے لئے وہ وہم میں مبتلا ہو گیا۔
وہ کسی جگہ پر جا کھڑا ہوتا — چاروں طرف نگاہ دوڑاتا اس اُمید کہ شاید درست نمبر سمجھانے والا کوئی اشارہ مل جائے
ایک دن وہ اِسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ قریب سے ایک بچہ گزرا اُس کے ہاتھ میں شیشے کا گلاس تھا اور گلاس میں دو پیسے پڑے

ہوئے تھے۔ شاید وہ دو پیسوں کا دودھ لانے جا رہا تھا۔ اس بچے کو ٹھوکر لگی اور گلاس اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ پاس کھڑے لوگوں اور فیض نے لپک کر اُس بچے کو اٹھایا۔ "حیرت ہے بچہ بھی اِس زور سے گرا ہے۔ مگر شیشے کا گلاس نہیں ٹوٹا۔"

فیض نے سوچا اور دیکھا کہ گلاس میں پڑے ہوئے دو پیسے لڑھکتے ہوئے اس کے قدموں میں آ گرے تھے۔ فیض نے وہ پیسے اُٹھا کر اُس بچے کے ہاتھ میں تھما دیئے اور گننے لگا "گلاس کا پہلا کاف۔ الف ایک۔ گ کے گیارہ۔ گیارہ کا بھی نمبر ایک بنا۔ اس لئے گلاس کا نمبر بھی ایک بنا۔"

پھر اُسے خیال آیا۔ "اور وہ دو پیسے جو لڑھک کر میرے قدموں کے آگے آ پڑے تھے۔ ان کے نمبر بھی گن دو" اس نے گلاس سے ایک نمبر لیا اور دو پیسوں سے دو۔ اس نے ڈبل داؤ لگا دیا۔ ایک اوپننگ دو کلوز نگ۔ اس روز اس نے ایک روپے کا داؤ لگایا۔ دوسرے دن اس کے نمبر ٹھیک نکل آئے اور اُسے ۸۱ روپے مل گئے۔

(۳)

کاردار نے ایک روز فیض کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے

اپنی کار روک کر ہارن بجایا اور فیض کو آواز دی۔
"میاں جی ـــ میں ابھی آیا ـــ" فیض نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر جواب دیا۔
"نہیں ۔ نہیں ـــ تم وہیں رہو ـــ میں اوپر آرہا ہوں"
نیچے سے کاردار نے کہا۔ اور وہ سیڑھیاں چڑھ کر فیض کے کمرے میں آگیا۔
"دوست میں بٹوہ گھر بھول آیا ہوں۔ تھوڑے سے پیسے دیدو۔" کاردار بولا۔
"میاں جی، جتنے پیسوں کی ضرورت ہو لے لیجئے" فیض نے جیب سے کچھ روپے نکالے۔
کاردار نے پانچ روپے اُٹھا لئے۔
"اور لے لیجئے ـــ" فیض کہتا رہا۔ مگر کاردار نے صرف پانچ روپے لئے۔ کاردار چلا گیا اور فیض سوچتا رہا۔ "میں تو کہہ رہا تھا میاں جی اوپر نہ آؤ، میں نیچے آرہا ہوں۔ لیکن وہ زبردستی میرے کمرے میں چلے آئے ـــ میرے منع کرنے پر بھی آ گئے ان کی اور میری خوش قسمتی ہے ـــ ان کا نام ہے کاردار ـــ لہذا نمبر بنا چار ـــ پھر انہوں نے روپے مانگے ـــ میں تو زیادہ روپے دے رہا تھا ـــ مگر انہوں نے صرف پانچ روپے لئے۔ لہذا نمبر بنا پانچ ـــ پہلے اُن کا آنا اور پھر روپے

لینا — میں ڈبل داؤ لگاؤں گا — اوپننگ چار — اور کلوزنگ پانچ — "

اس روز فیض نے پانچ روپے داؤ پر لگا دیئے — دوسرے دن سویرے اُس کے دونوں نمبر ٹھیک نکلے اُسے چار سو پانچ روپے مل گئے۔

"میرا انگلینڈ کا کرایہ بن گیا — کچھ روپے میں نے پہلے ہی جمع کر رکھے ہیں — " فیض نے جلد ہی فارم پُر کروا کے پاسپورٹ کے لئے درخواست دیدی۔

(۴)

پاسپورٹ بن گیا — فیض نے سُرخ رنگ کی جلد والے پاسپورٹ کو بار بار دیکھا۔ اُس کے پیروں میں جیسے زنجیر پڑ گئی تھی — وہ تصوّر کر رہا تھا کہ وہ ناگ پاڑے کے جھونپڑے سے کمرے میں نہیں بیٹھا ہوا تھا بلکہ انگلینڈ کی رائل اکیڈمی میں کھڑا تھا۔

دوپہر ڈھل گئی — فیض کے قدم اپنی روز کی عادت کے مطابق سٹّہ والی جگہ پر پہنچ گئے — وہ دائیں بائیں

دیکھتا ہوا اپنے نمبر کا کوئی اشارہ تلاش کر رہا تھا کہ ایک راہگیر نے بتایا کہ آج بازار میں کوئی ٹرام اپنی پٹڑی سے اُتر گئی ہے......

"ٹرام — نمبر بنا تین — " وہ نمبر تین پر داؤ لگانے لگا — "نہیں نہیں — یہ غلط نمبر ہے — ٹرام تو پٹڑی سے اُتر گئی ہے — ذرا سوچ لوں — " اور وہ سوچنے لگا۔

"یہ تین تو منفی ہونے چاہئیں — دس میں سے گئے تین۔ باقی رہ گئے سات — " اس نے سات نمبر پر داؤ لگا دیا۔

صبح سویرے ہی نمبروں کا نتیجہ نکل آیا تھا۔ فیض منہ اندھیرے ہی اُٹھ بیٹھا اور اپنی آنکھیں ملتا ہوا بازار میں آ گیا — "آج کا نمبر سات — " آواز آ رہی تھی۔ فیض آج بھی جیت گیا۔

وہ اپنے کمرے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اخبار بیچنے والے ایک لڑکے کی آواز آئی۔

"جنگ کا اعلان ہو گیا — دوسری بڑی جنگ!"

فیض کے پاؤں اس سیڑھی پر جم کر رہ گئے — "جنگ — تو پھر انگلینڈ.........!" اس کا سر چکرانے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جنگ نے اپنا پہلا حملہ اُس کے سینے پر

کر دیا تھا — پہلی گولی — کسی بندوق کی پہلی گولی اس کے عزم سفر پر لگی تھی۔

(۵)

نیفں اُس جگہ پر اُداس اور نڈھال کھڑا تھا۔ جہاں وہ روز کھڑا ہوتا تھا — سٹّہ والی جگہ — وہی شام کے چھ بجے تھے — ایک یہودی لڑکی پھول دار سکرٹ (لہنگا) پہنے ہوئے اس کے قریب سے گذر گئی۔

وہ لڑکی باقاعدگی سے اُس وقت وہاں سے گذرتی تھی۔ نیفں نے اُسے کئی بار دیکھا تھا — پھر اُسے پتہ چلا تھا کہ وہ پاؤڈر بنانے والی کسی فیکٹری میں کام کرتی تھی — نیفں اپنے کام سے اُسی وقت لوٹا کرتا تھا۔

اس لڑکی کو نیفں نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا۔ لیکن آج وہ بہکی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا — گورا رنگ۔ چھریرا بدن — ترشے ہوئے ہونٹ اور آنکھیں...... اور پھر وہ لڑکی سامنے کے مکان کی سیڑھیاں چڑھ گئی — شاید — شاید اس کے دل کا ایک ٹکڑا گم ہو گیا تھا۔

فیض وہیں کا وہیں کھڑا رہا ۔ شاید اپنے کھوئے ہوئے دل کا حساب لگا رہا تھا ۔ اس کے کندھوں کو چھوتا ہوا ایک رومال اس کے قدموں میں آگرا ۔ فیض نے رومال اُٹھا لیا ۔ "یہ رومال مجھ پر کیوں گرا؟" اس نے اوپر کی طرف دیکھا ۔

اوپر کھڑکی میں وہی لڑکی کھڑی ہوئی تھی ۔

وہ لڑکی مسکرائی ۔

فیض مسکرایا ۔

ہاتھ میں رومال پکڑے ہوئے وہ کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا ۔ اور پھر وہ بھول گیا کہ وہ کیسے وہاں کھڑا تھا ۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ انگلینڈ کی رائل اکیڈمی میں کھڑا تھا ۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر لٹکی ہوئی تھی اور وہ سر اونچا کرکے تصویر کو دیکھ رہا تھا ۔

( ۶ )

اگلے روز ۔ اسی جگہ ، اسی وقت ۔ وہی لڑکی وہاں سے گذری ۔ لڑکی کے ہاتھ میں کتنے ہی چھوٹے چھوٹے بنڈل

تھے ۔ اس کے ہاتھوں سے تین چار بنڈل گر پڑے ۔ فیض نے
نیچے گرے ہوئے بنڈل اُٹھالئے اور ہاتھوں سے اُن کی مٹی جھاڑتے
ہوئے وہ بنڈل اس لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیئے ۔
پھر فیض کو یوں محسوس ہوا جیسے اس لڑکی نے اپنے سر کو جنبش دے
کر کوئی اشارہ کیا ہو ۔ وہ آگے آگے چل پڑی اور فیض اس کے
پیچھے پیچھے ہولیا ۔ بازار کو پار کرنے کے بعد بڑی سڑک آگئی ۔
وہ لڑکی رُک گئی ۔ فیض بھی چلتے چلتے رک گیا ۔
ایک بس آئی ۔ کچھ مسافر اس میں سوار ہوئے ۔ وہ لڑکی بھی
بس پہ چڑھ گئی ۔ بس کی سلاخ کو پکڑ کر اُس نے فٹ پاتھ پہ کھڑے
فیض کی طرف دیکھا ۔ جیسے کہہ رہی ہو تم بس پر کیوں نہیں چڑھتے
بس چل پڑے گی ۔ ، فیض تیزی سے بس میں سوار ہو گیا ۔
" میرا نام لینا ہے اور تمہارا ؟ "
" فیض ۔ "
پھر دونوں خاموش ہو گئے ۔
" ٹکٹ ؟ " کنڈکٹر نے پوچھا ۔
لینا فیض کے منہ کی طرف دیکھنے لگی ۔
" مالابار ہلز ۔ " فیض نے آہستہ سے کہا ۔
کنڈیکٹر نے دو ٹکٹ دیدیئے ۔
یہ باغ بہت اونچی پہاڑی پر تھا ۔ اس کے ایک گوشے میں

بمبئی کی بلند عمارتیں بھی پست نظر آتی تھیں ـــ فیض کو یوں محسوس ہوا کہ وہ ہوائی جہاز میں بیٹھا ہے ـــ شہر کی روشنیاں جھلملا رہی ہیں ـ

لین کی ٹھنڈی اور نرم باہیں فیض کی باہوں میں پھنسی ہوئی تھیں ـ اس کے پاؤں دھرتی کو نہیں چھو رہے تھے وہ آسمان میں اُڑ رہا تھا ـ

(۷)

"تو ہمارا دوست ہے ـــ اپنا آدمی ہے ـــ بتا تو ہمارے لئے کیا کر سکے گا ـــ ہم ایک پنجابی فلم بنا رہے ہیں ـ" خورشید اور لالہ یعقوب نے اُس سے کہا ـ

"جو کہو گے ـــ وہی کروں گا ـ جو مجھ سے ہو سکے گا کر دوں گا ـــ" فیض نے دوستوں کو یقین دلایا ـ

اس رات کو فیض کی آنکھوں میں کسی پنجابی لڑکی کا حسن تھا اُسے نیند نہیں آ رہی تھی ـــ وہ اُٹھ بیٹھا ـــ کمرے کی بتی روشن کی ـــ کمرے میں ایک طرف کھڑکی کے قریب اُس کی چارپائی بچھی ہوئی تھی ـــ دیوار کے ساتھ طانپورہ ٹنگا ہوا تھا ـ ایک چھوٹے

میز پر کاغذ رنگ اور برش پڑے تھے۔ ایک طرف دو تین برتن۔ ڈبے اور شیشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کھونٹی سے کچھ کپڑے لٹک رہے تھے۔ مگر فیض کی آنکھوں میں کوئی چیز جھلملا رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ ایک لڑکی۔ نوجوان۔ چہرے پر نئی نئی بیدار ہونے والی محبت کی چمک۔ ہاتھ پاؤں میں اک خمار۔ پھر اس کی ناک میں نتھ چمک اٹھی۔ پھر اس کے گلے میں گوٹہ کناری والا کرتا پڑ گیا۔ اس کے بالوں کی کسی نے مینڈھیاں گوندھ دیں۔ دونوں کانوں کی بالیوں میں موتی دمکنے لگے فیض نے کاغذ اٹھایا۔ برش لیا اور اپنے تصور کو کاغذ پر اتارنے لگا۔ اس نے ایک تصویر بنائی۔ دو تصویریں بنائیں۔ تین تصویریں بنائیں۔ اس کا تصور ایک جگہ نہیں ٹھہرتا تھا۔ وہ کاغذ پہ پنجابی لڑکی اور پنجابی طرزِ زندگی میں رنگ بھرنے لگا۔

دوسرے دن وہ سارے کاغذ سنبھال کر فلم کے دفتر چلا گیا۔

"کمال ہو گیا۔" اس کے دوستوں کی باچھیں کھل گئیں "یہ ہم الگ الگ اپنے ڈسٹری بیوٹروں کو بھجوا دیتے ہیں۔ ورنہ ہم تو اس انتظار میں رہتے۔ کہ کب کچھ

ہو گا۔ کب تصویریں بنیں گی اور کب ہم کچھ نمونے انھیں بھیجیں گے ـــ یہ تو شو کارڈ بن گئے ہیں ـــ اور ابھی بن گئے ہیں۔"

فیض نے اگرچہ کبھی کاردار کی شاگردی نہیں کی تھی۔ لیکن لاہور میں رہتے ہوئے جب اُسے اس کام کا شوق ہوا تھا تو سب سے پہلے کاردار کے پوسٹر دیکھ کر ہی ہوا تھا ـــ اس کے دل میں بھی کچھ ایسے ہی پوسٹر بنانے کا ولولہ اُٹھا تھا ـــ وہ کاردار کے پوسٹر دیکھتا رہتا تھا اور پھر کاغذ اُٹھا کر ویسے پوسٹر بنانے لگتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے دل ہی دل میں کاردار کو اپنا استاد کہا کرتا تھا۔

کاردار نے فیض کا کام دیکھا تو اُٹھ کر اُسے گلے لگا لیا اور اُس کی پیشانی چُوم لی۔

"میرے ساتھ موٹر میں بیٹھ جا ـــ مجھے کسی ضروری کام سے کہیں پہنچنا ہے۔ راستہ میں تجھ سے باتیں کروں گا۔"

کاردار نے کہا اور فیض کو موٹر میں بٹھا کر مہتاب کے گھر چلا گیا ـــ آج اُسے اپنی فلم "شاردا" کے لئے مہتاب کو ہیروئن بننے کی دعوت دینا تھی۔

مہتاب سے ایک اقرار نامے پر دستخط کروا کے کاردار فیض کو اپنے گھر لے گیا۔

"ہاں ۔ اب بات کر ۔ کیا تو میرے ہاں کام کرے گا ۔"

"ہیں ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔ ؟"

"کیا ایسے شو کارڈ تو میرے لئے بنائے گا ؟"

"آپ تو میرے اُستاد ہیں ۔ آپ کے سامنے میں کام نہیں کر سکوں گا ۔ آپ کی کھینچی ہوئی لکیریں دیکھ دیکھ کر تو میں نے کچھ لکیریں کھینچنا سیکھی ہیں ۔"

"تو نے مجھے اُستاد کہا ہے ۔ اُستاد کی حکم عدولی نہیں کیا کرتے ۔ تو اِسے میرا حکم ہی سمجھ لے ۔"

فیض کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے کاردار کے اِس جملے نے اُسے لاجواب کر دیا ہو ۔

کاردار نے کاغذ نکالا ۔ "یہ رہا اقرار نامہ ۔ جتنے روپے تیرا جی چاہے اِس پر بھر لے ۔ اور نیچے اپنے دستخط کر دے ۔"

فیض نے دستخط کر دئے اور اوپر کچھ نہ لکھا ۔ "یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا ۔ آپ کا جو جی چاہے اوپر لکھ دیجئے ۔ میں کام کروں گا ۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا ۔ میں کروں گا ۔"

"شو کارڈ ۔" فلمی دنیا کی تصویروں میں یہ نئی چیز پیدا کرنے والا پہلا فنکار فیض ہی تھا ۔

---

(۴)

نیفی نے بلایا اور لینا آگئی — آج اس کے ہونٹوں پر کوئی شکوہ تھا۔

نیفی نے اُس کے ہونٹوں پر بوسہ دیا — لیکن اُس کا دل کسی آنچ سے نہ پگھلا۔

"رات کو تمہارے کمرے میں کون تھا —" لینا نے اپنے غصہ کا نازیبا نہ لگایا۔

"میرے کمرے میں — ! کون تھا میرے کمرے میں۔"

"میں رات کو کسی کام سے آئی تو تمہارے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔"

"پھر ؟"

"کمرے کی کھڑکی میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔"

"ایک لڑکی ؟" نیفی مسکرایا۔ "پگلی کہیں کی — وہ تو میری پڑوسن تھی۔"

"میں جانتی ہوں وہ فرحا تھی۔ اُس نے "پردا"[1] پہن رکھا

---

[1] یہودی لڑکیوں کا شب خوابی کا لباس

تھا۔ وہ کیا کرنے آئی تھی رات کو۔"
"رات کو — یونہی آگئی تھی —" فیض نے لینا کو چڑانے کی غرض سے کہا۔
— نے روتی صورت بنا لی۔ فیض نے اُسے دلاسہ دیا۔
"یوں ہی آئی تھی اُردو پڑھنے — اُس کی بہن بھی اس کے ساتھ تھی"
"تم یہ کمرہ چھوڑ دو۔" لینا بولی اور ہنس دی۔
"کمرہ میں چھوڑ دوں گا اور جو کمرہ تم کہو گی، وہی میں لینے کو تیار رہوں۔ مگر ایک شرط ہے۔"
"وہ کیا؟"
"تم مجھ سے شادی کر لو۔"
لینا خاموش ہو گئی — بالکل خاموش۔
"کیوں؟" فیض نے لینا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
"شادی — میری ماں نہیں مانے گی۔" لینا نے اپنا سر جھکا لیا
دونوں کے جسموں کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا۔ لیکن دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک خاموشی زبردستی اُن کے درمیان آ کر بیٹھ گئی ہو — اِس خاموشی کو دونوں میں سے کوئی

بھی نہ اُٹھا سکتا تھا۔

(۹)

آج فیض کو ایک تلخ نشے کی ضرورت تھی — شراب اور سٹّہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے اندر کوئی چیز سُن اور جامد ہوئی جا رہی تھی — کوئی چیز یوں سو گئی تھی کہ اُس پر ہاتھ پھیرنے اور چُٹکی کاٹنے سے بھی کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا — "کوئی بہت تلخ چیز...... کوئی — نہ جانے کیا —" فیض سوچ رہا تھا — "چاہے وہ میرا کلیجہ ہی کیوں نہ ہو بک دے — لیکن ایک بار مجھے جھنجھوڑ کر ضرور رکھ دے۔"

پھر چارپائی پر پڑے ہوئے فیض نے اپنی میز کی طرف دیکھا — رنگوں کی شیشیوں میں جیسے رنگ جم گیا تھا — اب اُس کا برش کسی بھی رنگ سے ہولی نہیں کھیل سکتا تھا — پھر اُس نے دیوار سے ٹنگے ہوئے طانپورہ کی طرف دیکھا — ایک مکڑی نے اُس پر جالا بن دیا تھا اور اب اُس سے جیسے کوئی نغمہ نہیں اُبل سکتا تھا۔

اور پھر فیض نے محسوس کیا کہ اُسے اُٹھ کر کھڑا ہو جانا چاہیے۔ چلنا چاہیے — دوڑنا چاہیے — ورنہ اُس کی ٹانگیں اس چارپائی سے بندھ جائیں گی — فیض نے یہ بات تو سوچی مگر اُس سے اُٹھا نہ گیا۔ اُس نے اچھے بھلے۔ چلتے پھرتے اور دوڑتے لوگوں کا تصور کیا — "تازہ دم لوگ تیز تیز چلتے ہیں — گھوڑوں کی طرح دوڑتے ہیں ........" فیض کا خیال لوگوں کی طرف سے ہٹ کر گھوڑوں کی طرف چلا گیا۔

"گھوڑے .......... ریس ......" فیض کے دل میں یہ خیال

سرسرایا۔

اگلے روز اتوار تھا — فیض نے اپنی جیب میں بہت سے پیسے ڈالے اور ریس کورس کا ٹکٹ لیا۔

"رِدن" — اس نے ایک گھوڑے پر دس روپے لگائے اِس گھوڑے پر بہت سے لوگ روپے لگا رہے تھے۔ فیض اُن کے نقشِ قدم پر چلا — وہ گھوڑا ہار گیا — فیض دس روپے گنوا بیٹھا۔

"پلیس۔" اگلی بار اُس نے پانچ روپے لگائے۔ یہ گھوڑا ابھی ہار گیا۔ فیض پانچ روپے اور گنوا بیٹھا۔

ستہ کے پُرانے دہم نے فیض کے دل میں ایک چٹکی لی "میں ذرا جگہ بدل کے دیکھوں — جس جگہ کھڑے ہو کر میں نے

دو بار داؤ لگایا تھا ــــ وہاں تو میں دونوں ہی بار ہار گیا۔
یہ جگہ منحوس ہے ــــ " اور فیض نے ایک تنہا گوشے میں اپنے لئے جگہ تلاش کرلی ــ اس بار اُس نے ایک گھوڑے پر پانچ روپے پیلیس لگائے۔

گھوڑے دوڑ رہے تھے ــ تیز اور بھی تیز ــ ایک دوسرے سے بازی لیجانے کے لئے ــــ جس شخص نے کسی گھوڑے پر داؤ لگایا ہوتا تھا۔ وہ گھوڑے کی طرح خود تیز دوڑ رہا ہوتا تھا ــــ جس کا گھوڑا پیچھے رہ جاتا۔ اُس کی اپنی ٹانگوں کے پٹھے چڑھ جاتے ــــ اس کا جی چاہتا اگر اس کا بس چلے تو وہ اپنی ٹانگوں کی قوت بھی گھوڑے کی ٹانگوں میں ڈال دے۔

فیض کی آنکھیں اپنے گھوڑے کا تعاقب کر رہی تھیں۔ گھوڑے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُڑ رہی تھیں ــ اُس کے گھوڑے نے کچھ اِس طرح چوکڑی بھری کہ وہ سب سے آگے نکل گیا۔ فیض کی ٹانگوں میں جمی ہوئی کوئی چیز پگھل گئی ــ وہ دوڑتا ہوا کھڑکی کے قریب گیا ــ اُس کا گھوڑا جیت گیا تھا۔

"یہ جگہ بہت مبارک ہے۔" فیض کا وہم یقین میں تبدیل ہوگیا ــ اگلی بار اُس نے دس روپے کا داؤ لگایا اور تیزی سے بھیڑ کو چیرتا ہوا اپنی جگہ پر آ گیا ــ اُس کے آتے آتے

ایک اور شخص اُس جگہ کھڑا ہو گیا ۔ عین اُسی جگہ پر ۔ اس شخص نے اپنی کہنیاں کچھ اِس طرح پھیلا رکھی تھیں کہ کوئی دوسرا شخص اُس کے قریب کھڑا نہ ہو سکے ۔ فیض نے تھوڑی سی جگہ گھیرنی چاہی اور وہ سوچنے لگا ۔ "میں اسے ذرا کھسکا دوں گا........ آہستہ آہستہ سرکتا ہوا اپنی جگہ پر چلا جاؤں گا ۔" اس نے ذرا سی ٹانگ اڑا لی ۔ مگر وہ پہلے سے اس جگہ کھڑے ہوئے شخص کو کھسکا نہ سکا۔

گھوڑوں نے دوڑنا شروع کر دیا تھا ۔ فیض کبھی گھوڑوں کی طرف دیکھتا اور کبھی اپنی جگہ کی طرف ۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اگر وہ اپنی جگہ پر کھڑا نہ ہو سکا تو اس کا گھوڑا ہار جائے گا ۔

وہ شخص بھی جیسے وہاں جم کر کھڑا تھا ۔ دونوں کی بانہیں آپس میں رگڑ کھا رہی تھیں ۔ اِس دھکم پیل میں فیض نے اپنے لئے تھوڑی سی جگہ بنا لی ۔ اُس نے اپنے سامنے دیکھا ۔ دو گھوڑے ایک دوسرے کے ساتھ دوڑ رہے تھے ۔

فیض نے تیزی سے اُس شخص کو دھکا دیا ۔ اب کے وہ فیض کے اِس دھکے کو سہہ گیا اور اس نے فیض کو تھوڑی سی جگہ بھی دی ۔ اب یہ جگہ اُن دونوں کے قدموں تلے بٹی ہوئی تھی ۔

دونوں نے گھبرا کر سامنے دیکھا — دونوں برابر دوڑتے ہوئے گھوڑے پیچھے رہ گئے تھے اور کوئی تیسرا گھوڑا پیچھے سے آکر اُن سے آگے نکل گیا تھا۔ فیض اور وہ شخص دونوں ہی ہار گئے۔

"اگر تم مجھے تھوڑی سی جگہ دے دیتے اور میں اپنی پہلی جگہ پر جا کھڑا ہوتا تو ضرور جیت جاتا۔" فیض نے کہا۔

"میں آج بہت ہار رہا تھا — میں جگہ بدل کر دیکھنا چاہتا تھا۔ جو تم مجھے دھکّا نہ دیتے تو میں ضرور جیت گیا ہوتا۔" دوسرا شخص بولا۔

اور پھر وہ دونوں ہنس پڑے — جیسے ایک دوسرے کی طرح ہار گئے تھے — دونوں ایک دوسرے کی طرح وہم میں مبتلا ہو گئے تھے۔

فیض اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ آج وہ کچھ روپے ہار گیا تھا — اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے اِن روپوں سے اپنے خوابیدہ باطن کو بیدار کرنے کے لئے کوئی دوا ضرور خرید لی تھی۔

اُس نے اپنے کمرے کی بتّی جلا کر اپنے کمرے پر نظر ڈالی۔ سامنے کھڑکی کے قریب اُس کی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف میز پر رنگ کی شیشیاں تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ

طانپورہ ٹنگا ہوا تھا۔ اُس کا ہاتھ جیب میں کوئی رومال ڈھونڈنے
لگا — پہلے اُس نے رنگوں کی بند شیشیاں پونچھیں اور پھر
اُس نے طانپورے کے چار تاروں پر سے مکڑی کا جالا اُتار
دیا۔

(۱۰)

رنگ کی شیشیوں میں رنگ پگھل گئے۔ طانپورے کے
سروں میں سُر بیدار ہو گئے — فیض نے اپنے لئے ایک دوا ڈھونڈ
لی تھی — جس طرح رت جگے کی ماری ہوئی آنکھیں رحم طلب انداز
میں نیند کی گلی میں جھانکتی ہیں۔ اُسی طرح فیض ریس کی تاریخوں
کی طرف گھورنے لگا۔ پہلے پہل تو وہ اپنے شہر کی حد میں رہا اور
پھر پونہ بھی پہنچنے لگا۔ اور پھر دلی۔ لاہور۔ سکندرآباد۔ بنگلور
— وہ کراچی بھی جانے لگا۔
"تو جو کچھ کماتا ہے۔ جا کر اُن کے حوالے کر آتا ہے —"
بعض اوقات فیض کا سب سے گہرا دوست یہ بات چھیڑ دیتا
مگر فیض تیزی سے یہ بات کاٹ دیتا — "اُن کے حوالے نہیں
کرتا ہوں۔ وہ تو میرے بنک ہیں بنک — وہاں روپے جمع

کرواآتا ہوں ۔ اور ایک دن ـــ " فیض یقین کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ۔ " ایک دن میں اِسی بنک سے ساری رقم نکلوا لوں گا ۔ مع سود نکلوا لوں گا ـــ ایک دن میں بہت جیتوں گا"

بمبئی ـــ مدراس اور کلکتہ میں بیک وقت ریس ہوتی تھی ۔ اس لئے بمبئی میں رہتے ہوئے فیض کو مدراس یا کلکتے نہیں جانا پڑتا تھا ـــ ویسے ہندوستان کا کوئی ایسا مقام نہیں چھوڑا تھا جہاں ریس ہوتی ہو اور وہاں وہ نہ پہنچا ہو ـــ انگلینڈ ہی ایک ایسا دیس، تھا جہاں وہ نہ پہنچ سکا تھا ـــ وہاں جب ریس ہوتی تو وہ بمبئی میں بیٹھے ہوئے وہاں کی ریسوں پر روپے لگا دیتا ـــ " کہاں انگلینڈ کی رائل اکیڈمی اور کہاں انگلینڈ کا ریس کورس ۔" اُسے کس سڑک پر جانا تھا اور کس سڑک پر چل نکلا تھا ـــ کبھی کبھی وہ بڑی بیچارگی سے اپنے اِرد گرد دیکھتا ـــ اُس کا جی چاہتا ـــ " کاش کہیں سے کوئی ہاتھ اُس کے ہاتھ میں آجائے ـــ وہ ہاتھ اُسے مضبوطی سے پکڑلے اور ایک سڑک سے گھسیٹ کر دوسری سڑک پر لے جائے ۔ "

فیض جس سڑک پر چل نکلا تھا ـــ ایک ضدّی بچّے کی طرح اُسی سڑک پر ہولیا تھا ـــ کبھی وہ رک جاتا ۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ـــ اِنتظار کرنے لگتا ـــ جیسے کوئی اس کے پیچھے پیچھے

اُسے منانے کے لئے آ رہا ہے مگر سڑک ویران اور سنسان ہوتی۔
وہ دانت پیستا اور اپنا پاؤں زور سے سڑک پر پٹکتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔

اسی سڑک پر چلتے چلتے وہ بنگلور جا پہنچا۔ اب وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔

اپنے کمرے کے برآمدے میں کھڑا ہوا نہ جانے کس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے والے برآمدے پر جا پڑی۔

وہاں ایک بانکی ترچھی مدراسن کھڑی ہوئی تھی۔ بڑے جامنی رنگ کی اس نے دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل کی موٹی موٹی دھاریاں تھیں اور باہر سر نکال کر اپنے لمبے اور سیاہ بال سکھا رہی تھی۔

فیض کے ہاتھوں میں کاغذ اور پنسل تھی — وہ اس مدراسن کا سارا حسن و جمال اپنے کاغذ پر اُتارنے لگا۔ مدراسن نے اُسے بار بار اپنی طرف اور پھر کاغذ کی طرف تاکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ لیکن وہ وہیں کھڑی رہی اور اس نے فیض کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی۔

فیض نے اسکیچ تیار کر لیا — ایک نظر اس عورت کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ اور اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذ فیض سے طلب کیا۔ فیض نے کاغذ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو سنبھالتی اور دوسرے ہاتھ سے کاغذ پکڑتے ہوئے وہ عورت کتنی دیر تک خاموش کھڑی رہی اور پھر جب اُس نے فیض کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھیں تعریف و توصیف سے لبریز تھیں۔

"آرٹسٹ۔۔" اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں۔" فیض نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہاں کیسے؟" اس عورت نے سوال کیا۔

"ریس کے لئے آیا ہوں۔" فیض نے جواب دیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔۔ فیض کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی تھی "دوڑتے ہوئے گھوڑوں کا تماشا دیکھنے کی بجائے تم گھوڑوں کے اسکیچ کیوں نہیں بناتے۔"

اس رات فیض اسی برآمدہ میں کھڑا تھا۔ آج دن کو وہ ریس میں بہت ہار گیا تھا ۔۔ اس کی نظر ساتھ والے برآمدے پر نہیں تھی۔ پھر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے آواز دی ہو ۔۔ اس نے چونک کر ساتھ والے برآمدے کی طرف دیکھا ۔۔ وہی بانکی ترچھی مدراسن اُس سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا جیت گئے ہے؟"

"نہیں۔" فیض نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیا بہت ہار گئے؟"

"ہاں ۔" نیفی نے سر جھکالیا۔
مدراسن نے اُس سے کچھ نہ پوچھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔
صبح سویرے نیفی کے کمرے کا دروازہ کھلا ۔ اس کے سامنے وہی بانکی ترچھی مدراسن کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی۔
"اب ہم جا رہے ہیں ۔ اسی گاڑی سے جا رہے ہیں۔ اگر تم کبھی مدراس آؤ تو ہمارے گھر ضرور آنا ۔"
یہ بات اس نے ہکلاتے ہوئے کہی ۔ دراصل وہ اچھی طرح ہندی نہیں بول سکتی تھی۔
"ضرور آؤں گا ۔" نیفی نے اس کی دعوت کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔
"یہ میرا پتہ ہے۔" مدراسن نے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نیفی کے ہاتھ میں دیدیا اور وہ وہاں سے چلی گئی۔
نیفی نے وہ کاغذ جوں کا توں میز پر رکھ دیا اور پھر برآمدے میں کھڑا ہو کر نیچے دیکھنے لگا ۔ مدراسن کو جاتے ہوئے وہ ایک بار دیکھنا چاہتا تھا نیچے ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی ۔ اندر سے سامان آتا گیا اور ٹیکسی میں لدتا گیا ۔ پھر ایک مرد آیا۔ اس کے پیچھے دو مرد آئے ۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا اور پھر وہ خود آئی ۔ اس نے ٹیکسی میں رکھے ہوئے سامان کی گنتی کی۔ اور پھر بائیں طرف کا دروازہ کھول کر وہ ٹیکسی میں بیٹھنے لگی تو اس نے اوپر کی طرف دیکھا ۔ نیچے سے ایک مسکراہٹ برآمدے

کی طرف آئی — ایک مسکراہٹ برآمدے سے نیچے کی طرف گئی۔
ٹیکسی چلی گئی — فیض کافی دیر تک وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔
وہ ایک آہ بھر کر کمرے میں لوٹا — سامنے میز پر ایک تہہ کیا ہوا کاغذ پڑا تھا۔

"یہ اس کا پتہ ہے —" فیض کو یاد آیا اور اس نے کاغذ کھولا — اس کاغذ پر پتہ ضرور لکھا ہوا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ اس کاغذ میں دس دس کے پانچ نوٹ بھی لپٹے ہوئے تھے۔
"یہ کیا؟" فیض تیزی سے برآمدہ کی طرف لپکا جیسے کل کے اسکیچ کی طرح ساتھ والے برآمدے میں کھڑی ہوئی ہو اور اس کو یہ نوٹ پکڑانے جا رہا ہوں ...... پھر وہ وہیں کا وہیں کھڑا ہو گیا — "رات کو میں نے اس سے کہا تھا کہ میں بہت ہار گیا ہوں —" فیض سوچنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
اس نے میری ہار میں شریک ہونا چاہا۔

(۱۱)

"میاں جی — یہ کیا بنوایا ہے؟" ایک دن فیض نے سٹوڈیو میں قدم رکھا۔ اور کار دار سے پوچھا

"درزی سے پگڑی بنوائی ہے۔" ذرا دیکھو تو کیسی بنی ہے؟"

"کس کی پگڑی بنوائی ہے — کیا ملّا دوپیازہ کی؟" فیض ہنس پڑا۔

"نہیں — شاہجہاں کی — ایک بادشاہ کی فلم جو شروع کر رہے ہوں۔"

"اچھا اچھا — یہ بادشاہ کی پگڑی ہے — میں تو سمجھا تھا کہ ملّا دوپیازہ کی ہے۔"

کاردار فیض کے طنز کو بھانپ گیا اور بولا۔ "یہ سب تیرا قصور ہے — میرا کوئی قصور نہیں۔"

"میرا قصور؟"

"اور نہیں تو کیا — میں کون کون سا کام سنبھالوں۔ میرے ذمّہ سینکڑوں کام ہیں۔ تجھ سے کتنی بار کہا ہے کہ اپنی ضد چھوڑ دے۔ تو گھر بیٹھ کر بھی تو کام کرتا ہی ہے — میرے کسی کمرے میں کیوں نہیں بیٹھ جاتا — تو کبھی درزیوں کا کام بھی دیکھ لیا کرے گا۔ اُن کو کچھ سمجھا بھی دیا کرے گا۔ اُن کے جو جی میں آتا ہے بنا دیتے ہیں۔"

میاں جی کا شکوہ بجا ہے — "فیض نے سوچا اور دوسرے دن وہ سٹوڈیو میں بیٹھ کر کام کرنے لگا۔

پہلی تاریخ آئی — تمام ملازمین کو تنخواہ ملی ۔ کلرک نے نیض کو بلا کر ایک ہزار روپیہ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا ۔

" مہینے کا ایک ہزار روپیہ — اتنے روپیوں کا میں کیا کروں گا — " فیض نے نوٹوں کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ انہیں پہچانتا ہی نہ ہو ۔

(۱۲)

فیض اپنے میز کے کاغذوں پر جھکا ہوا تھا ۔ اُس نے محسوس کیا کہ سامنے کے کھلے دروازے سے کوئی اندر آگیا ہے ۔ وہ سمجھا سٹوڈیو کا ہی کوئی آدمی ہوگا — کمرہ میں کچھ لینے آیا ہوگا — وہ اپنے کاغذوں پر جھکا رہا — کافی دیر کے بعد اُسے احساس ہوا کہ کوئی شخص اس کے پاس کھڑا رہا تھا —

" لیناتم ۔ " ، فیض نے سر اُٹھا کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا ۔

مسکرا کر کُرسی پر بیٹھ گئی ۔

" تم یہاں کیسے ؟ " کافی دیر کے بعد فیض نے پوچھا ۔

" آگئی — بس آگئی — " لینا نے نیلے پھولوں والا

سکرٹ پہن رکھا تھا۔

"بس آ گئی ــــ" اس کا کوئی کیا جواب دیتا۔ فیض چپ ہو گیا۔ سٹوڈیو کا ایک شخص کبھی کسی کام سے اندر آیا اور کبھی دوسرے کام سے ــــ فیض سارے کام نمٹاتا رہا۔ لینا چپ چاپ بیٹھی رہی۔

آخر فیض ہی کو گفتگو کا آغاز کرنا پڑا۔ "پھر بھی لینا تم یہاں کیسے آئی ہو؟"

"ایک روز تم نے کہا تھا ــــ" لینا اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے جوڑے کی ڈور اپنی انگلیوں پہ لپیٹنے لگی۔

"میں نے کیا کہا تھا لینا؟" فیض کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"تم نے شادی کے لئے کہا تھا ــــ" لینا نے ہمت کر کے یہ بات کہہ دی۔

فیض لینا کے گہرے اور سفید چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک بار تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس چہرے کو پہچانتا نہیں تھا۔ وہ اپنی آنکھیں جھپکنے لگا۔

ــــــــــــــــــــ۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ وہ اس چہرے کو پہچانتا تھا۔ مگر ان ہونٹوں سے ناواقف تھا

"کیا تیری ماں اب مان گئی ہے۔"

"ماں ــــ نہیں، ماں تو نہیں مانتی۔ لیکن میں چوری چھپے

تم سے شادی کر لوں گی۔"

نیفض کے من کی گتھی اُلجھ گئی — کبھی وہ کوئی ڈور پکڑتا اور کبھی کوئی — لیکن ڈور کا سرا اس کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا —

"یہ شادی مجھ سے نہیں — لینا یہ شادی میری ایک ہزار کی تنخواہ سے کر رہی ہے۔"

نیفض نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔ "یہ بات تو تم اُس وقت بھی کہہ سکتی تھیں۔ مگر تم نے یہ بات نہ کہی۔ اب دیر ہو چکی ہے بہت دیر — !"

(۱۳)

سجاد حسین فیض کا گہرا دوست تھا۔ جس طرح وہ سُر تال کے ساگر میں غوطہ مار کر موتی ڈھونڈ لایا کرتا تھا۔ اُسی طرح وہ کسی کے دل کی گہرائیوں میں جا کر دل کے رموز ڈھونڈ لایا کرتا تھا۔ وہ اتنا گمبھیر تھا کہ اُسے کچھ کہنے اور پوچھنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی — آج جب اُس نے فیض کی صورت دیکھی تو وہ اس کے دل کا بھید پا گیا۔ اس نے نہ کچھ کہا اور نہ ہی کچھ پوچھا۔ صرف اس کے قریب بیٹھ کر گانے لگا۔

آج فیض کا دل بہت بیقرار تھا۔ سجاد کی دھنیں اُسے جیسے آغوش میں لے کر تھپکیاں دینے لگیں۔

اس کے دل کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ نیند بھرتی جا رہی تھی۔ دھنوں کی لوری اور بھی میٹھی ہو گئی ـــ زیادہ ٹھنڈی ہو گئی۔

اب فیض کی حالت یہ تھی جیسے روتے روتے کوئی بچہ سو جائے اور پھر سوتے میں سسکیاں بھرتا رہے ـــ ایک بار سجاد نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا گاؤں فیض ۔ ؟"

نیند کے سکوت میں فیض نے جواب دیا۔

وہ تو چلے گئے ہیں دل، یاد سے اُن کی پیار کر
غم ہے ترے نصیب میں موت کا انتظار کر

سجاد گاتا رہا۔ فیض سنتا رہا۔ شام کے سائے بہت گہرے ہو گئے تھے۔ جس وقت سجاد فیض کے گھر سے روانہ ہوا، شام کے سائے دھیرے دھیرے رات بن گئے۔

فیض اپنے کمرے میں وہیں کا وہیں بیٹھا رہا ـــ اُسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کھوکا بھی ہے ـــ اور جہاں تک نیند کا تعلق تھا اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ سو یا پڑا ہے یا جاگ رہا تھا۔

فرحا آئی ۔۔۔ اس نے دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا
مگر کمرے میں روشنی نہیں تھی ۔
"شاید اندر کوئی بھی نہیں ۔۔۔" اس نے سوچا اور وہ واپس
جانے لگی ۔
پھر اُسے خیال آیا۔ "دروازہ کھلا ہوا ہے فیض آ تا ہی ہوگا۔ یہیں
کہیں نزدیک ہی گیا ہوگا ۔ " اور وہ کمرے کے اندر آ گئی ۔
فرحا نے بتی روشن کر دی ۔۔ سامنے دیوار سے ٹیک لگا کر
فیض بیٹھا ہوا تھا ۔ بیٹھا ہوا نہیں تھا بلکہ کمرے کی دیوار کے ساتھ
پڑا ہوا تھا
"کیوں کیا ہوا ؟" فرحا ڈر گئی ۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند
کر دیا اور فیض کے قریب آ کر بیٹھ گئی ۔
فیض نے فرحا کی طرف دیکھا ۔ لیکن خاموش رہی ۔ شاید
اُسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ سویا پڑا ہے یا بیدار ہے ۔
فرحا فیض کے قریب بیٹھ گئی ۔۔۔ پھر اس نے ہاتھ سے
فیض کا بازو ہلایا ۔
کچھ دیر تک فیض کے بازو جس و حرکت رہے ۔ پھر شاید
فرحا کے بازوؤں سے کوئی چیز نکل کر اس کے بازوؤں میں
بھر گئی اور فیض کی باہوں میں جان پڑ گئی ۔
فیض نے فرحا کو اپنی آغوش میں لے لیا فرحا نے کوئی

انکار نہ کیا ۔ فیض نے اُسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اور زور زور سے بھینچ لیا۔

پھر اس نے منہ جھکا کر فرحا کی سانسوں میں سانس لیا۔ جیسے کسی پکوان کی خوشبو سے کسی کو یہ بات یاد آجائے کہ اُسے بھوک لگ رہی تھی۔ اُس نے فرحا کو ایک بار چوما ۔ سو بار چوما ۔ اور چوم چوم کے اس کے ہونٹ جیسے چھل گئے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ آج وہ کسی بیل سر سے پاؤں تک سما جائے۔

........ نہ جانے رات کتنی جا چکی تھی ۔ جب فرحا اُٹھی ۔ اس نے سلوٹوں سے بھرے ہوئے اپنے کپڑوں کو ہتھیلیوں سے سنوارا اور پھر وہ آئینے کے آگے کھڑی ہو کر اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگی ۔ کنگھی کرتے ہوئے اُس نے ایک بار فیض کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہنے لگی ۔ " مینا اپنے بال کس طرح بناتی ہے ؟ کیا گھنگریالے ؟ کل میں بھی اُس جیسے بال بناؤں گی ۔ "

فیض نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا ۔ " کیوں فرحا کیا تجھے اپنے بال یوں اچھے نہیں لگتے ۔ یوں سیدھی نکالی ہوئی مانگ اور پیچھے کی طرف باندھے ہوئے بال ! "

" بہت اچھے لگتے ہیں ۔ " فرحا بولی اور آئینہ سے ہٹ کر اُس کے قریب آگئی ۔ وہ فیض کے کندھوں پر جھک گئی ۔ اور اُس کے کھلے بال فیض کے کندھوں پر گر پڑے ۔

دبی زبان میں بولی۔

"تم مجھ میں لینا کو ڈھونڈتے ہو نا۔ اِس لئے میں نے سوچا کہ میں کل سے لینا کی طرح بال بنایا کروں گی۔"

نیض نے پہلے تو فرحا کی ہتھیلیاں اپنی آنکھوں پر رکھ لیں اور پھر اس کی ہتھیلی کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ کہنے لگا۔

"نہیں فرحا۔ تو فرحا ہی رہنا۔ لینا نہ بننا۔"

---

(۱)

سامنے کی دیوار نفیس کو اپنی جگہ سے ہلتی ہوئی نظر آئی۔ کیا یہ ہوئی نہیں۔ وہ دیوار اُسے آہستہ آہستہ نزدیک آتی دکھائی دی۔۔۔ اس نے خوف کے مارے دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف کی دیوار بھی اس کے قریب آ رہی تھی۔ کمرے کی چوڑائی کم ہو رہی تھی ۔۔۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ ایک طرف کی دیوار اُس کے قدم چھونے لگی تھی اور دوسری طرف کی دیوار نے اس کے سر کو سہلانا شروع کر دیا تھا ۔۔۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا کمرہ قبر بنتا جا رہا ہے۔ "اب یہ چھت نیچے آگرے گی ۔۔۔ اور نیچے ۔۔" اس نے محسوس کیا۔ "میں چاروں طرف سے گھر جاؤں گا۔" اس کا سانس پھول گیا اور دم گھٹنے لگا

اس کے دل نے سنبھالا لیا۔ "بائیں طرف ایک کھڑکی ہے ۔۔۔ میں کھڑکی میں سے باہر کیوں نہ کود جاؤں ۔۔۔ کھڑکی سے کودنے کی کیا ضرورت ہے ۔۔۔ دائیں طرف دروازہ ہے اور دروازہ آج کھلا ہے۔ میں دوڑ کر دروازے میں سے باہر نکل جاؤں گا۔" لیکن اس کے جسم نے اس کے دل کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ وہیں کا وہیں پڑا رہا ۔۔۔

"مگر اب میں جلدی سے نہ اُٹھا۔ تو نہ جانے کیا ہو جائے"
فیض ڈر محسوس کرنے لگا ــــ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں اس کی نظر سکڑ گئی ــــ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے بائیں طرف کی کھڑکی اور دائیں طرف کا دروازہ کوئی باہر سے بند کر رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"دھک، دھک ــ دھک دھک ــ" اس کے دل کی آواز نے اس کے کانوں میں ایک شور برپا کر دیا۔ آخر کار اس نے دائیں ہاتھ سے اپنا سینہ دبایا جیسے وہ اپنے ہاتھ سے اِس آواز کو بھی دبا سکتا تھا۔

اس کی اُنگلیوں کے نیچے ایک کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ فیض نے چونک کر آنکھیں کھول دیں ــــ انگلیوں کو پھر ہلایا کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ پھر ہوئی۔

"یہ کیا ــ؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر ٹٹول کر قمیض کی جیب سے کاغذ باہر نکال لیا۔ گھور کر اُسے دیکھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس سے کچھ پڑھا نہیں جاتا تھا ــ اگر پڑھا جاتا تھا تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اُس نے اپنی موٹی موٹی آنکھیں پورا پورا زور لگا کر کھول دیں۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

لڑکے ہو، شہزادے ہو

سیّد تمہاری ذات ہے۔
چلو گھنگری، آؤ گھنگری
بِسنگھ نام دھر لینے ہو۔
یہ شیخ صدو عل کے لئے سٹہ کا نمبر بتاؤ۔ نہ بتاؤ تو بدھو ہو۔
حشر میں دامنگیر ہوں گا۔"
فیض بڑی افسردگی سے ہنسا ۔۔ اُسے یاد آیا۔ آج ایک بوڑھے نے اُسے بازار میں بہت اُداس اور نڈھال دیکھ کر پوچھا تھا "کیا بہت ہار گئے ہو سٹے میں!"
اور پھر فیض نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ بوڑھے نے اُس کا بازو پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھالیا تھا اور کہا تھا۔۔ "میں تجھے ایک "عمل" دیتا ہوں۔ تو جیت جائے گا۔"
دوپہر کو دیکھی ہوئی بوڑھے کی صورت فیض کی آنکھوں کے سامنے یوں آئی جیسے وہ بوڑھا اب بھی اس کے روبرو ہو۔ چہرے پر جھریوں کا جال ۔۔ جھریوں کی نالیوں میں جیسے ہنسی کا چشمہ بہہ رہا ہو ۔۔ اس کے پوپلے منہ سے یہ بھید کھل رہا تھا۔ "میں تجھے ایک "عمل" بتا دوں تو جیت جائے گا۔"
"سچ سچ؟" فیض نے کہا اور وہ دوبارہ کاغذ پڑھنے لگا بوڑھے کی آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی ۔۔ یہ عمل ہے شیخ سبدو کا ۔۔ آدھی رات کو تمام دروازے بند کر کے اُسے

ایک سو بار پڑھنا ــ تجھے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نظر آئے گا ۔ تو اس سے سٹہ کا نمبر پوچھنا ــ جو نمبر وہ تجھے بتائے تو دوسرے دن اُسی نمبر پر داؤ لگا دینا ــ جتنے پیسے تیری جیب میں ہوں سارے کے سارے لگا دینا ۔ پھر دیکھنا شیخ صاحب کی کرامات ۔"

کرامات کے لفظ نے فیض کی رگوں میں نہ جانے کیا کچھ دوڑا دیا ۔ اُس نے چارپائی سے اُٹھ کر اپنے کمرے کے دروازہ کو ٹٹولا ۔ دروازہ بند تھا ۔ اِس نے اندر چٹخنی چڑھا دی پھر ہوش و حواس سنبھال کر دونوں دیواروں کی طرف دیکھا ۔ دیواریں اپنی جگہ پر قائم تھیں ۔ کمرہ اتنا ہی بڑا تھا ــ فیض نے کاغذ ہاتھ میں پکڑ لیا ۔ اور اس نے پڑھنا شروع کر دیا ۔ ایک بار ــ دو بار ۔ ایک سو اکتالیس بار ــ

اور پھر وہ کان لگا کر منتظر رہا ــ "ابھی کچھ ہو گا ۔ ابھی کوئی کرشمہ ظہور نہیں آئے گا ــ " انتظار کرتا رہا ــ راہ دیکھتا رہا ۔ مگر کچھ نہ ہوا ۔ آخر اُکتا کر اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ توڑ مروڑ دیا اور دانت کٹکٹاتا ہوا اپنی چارپائی پر لیٹ گیا ۔ دوسرے دن اس نے اِس بوڑھے کو ڈھونڈ نکالا ۔ "دیکھ لیا تیرا شیخ صاحب ــ"

"کیا کچھ نہیں ہوا ؟" بوڑھے کی جھریوں سے ابھی تک ہنسی بہہ رہی تھی ۔

"کچھ بھی نہیں ۔" فیض نے زور سے ہنستے ہوئے کہا۔
"ایک ہی دن میں ہمت نہیں ہارا کرتے ۔ تین روز تو پورے کرو۔"
"اگر تین روز میں کچھ نہ ہوا۔"
"ہو گا ۔ ضرور ہو گا ۔ لیکن ایک بات ہے۔"
"کیا؟"
"کبھی بار شیخ بیتد مردوں کو نظر نہیں آیا کرتا۔"
"پھر؟"
"تو عمل پڑھتا رہ ۔ اگر وہ تجھے نظر نہ آیا تو تیری بیوی کو ضرور نظر آئے گا ۔ وہ عورتوں کو ضرور نظر آتا ہے ۔ تو اپنی بیوی کو کہنا کہ جب اُسے خواب میں کوئی نمبر دکھائی دے تو وہ اسے یاد رکھے ۔"
"مگر میری تو بیوی کوئی نہیں ۔"
"پھر ۔ پھر تو بہت مشکل ہے ۔"
"لیکن شیخ ضد مردوں کا کیوں نظر نہیں آتا۔"
"یہ ایک لمبی کہانی ہے ۔"
آج فیض کا اپنے کام میں جی نہیں لگ رہا تھا ۔ وہ بیکار تھا ۔ اِس لئے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور کہنے لگا ۔ "چلو شیخ ضد نہیں آتا تو نہ سہی ۔ تم اس کی کہانی ہی سنا دو۔"

بوڑھے نے کوئی انکار نہ کیا اور فیض کو شیخ کا افسانہ سنانے لگا — "ایک بار ایک شخص نے ایک فقیر کی بہت خدمت کی۔ وہ فقیر بہت پہنچا ہوا تھا — وہ شخص اس فقیر سے کوئی غرض نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس فقیر نے اُسے ایک چراغ دیا اور کہا۔ "جب کبھی تجھ پر مصیبت آجائے۔ تو نہا دھو کر کورے کپڑے پہننا اور اس چراغ کو روشن کرنا — تو جو مانگے گا تجھے مل جائے گا — "اس شخص نے وہ چراغ لے لیا لیکن طاق پر رکھدیا — کئی برس گذر گئے اس شخص کے بُرے دن آگئے — مصیبت کے ایام میں اُسے وہ چراغ یاد آیا — اس نے نہا دھو کر کورے کپڑے پہنے اور دیا روشن کیا — چراغ روشن ہونے کی دیر تھی کہ اس میں سے ایک جن نکلا۔ وہ شخص بہت ڈرپوک تھا — جن کو دیکھتے ہی بیہوش ہو گیا۔ اور جب اُسے ہوش آیا — چراغ بجھ چکا تھا۔ اس شخص نے گھبرا کر سوچا۔ میں اس چراغ کو لیجا کر کسی دریا میں پھینک آؤں گا۔ یہ تو بہت خطرناک ہے۔ اور وہ دریا کی طرف چل پڑا۔

راستہ میں اُسے ایک اور شخص ملا — اُس کا نام تھا شیخ وہ اسے جانتا تھا۔ پوچھنے لگا — " اس وقت کہاں جا رہے ہو؟ " اس شخص نے سارا قصہ سنایا۔ شیخ صدو نے اپنے دل میں کہا یہ شخص تو بیوقوف ہے۔ ایسی چیز اس کے ہاتھ لگی ہے اور وہ اسے دریا میں پھینک دینا چاہتا ہے۔ شیخ صدو نے

اس سے چراغ مانگ لیا۔

شیخ صدو نے نہا دھو کر اور کورے کپڑے پہن کر وہ چراغ جلایا اور جن سے کہا دریا کے اُس پار میرے لئے ایک محل بنا دے۔

محل تیار ہو گیا۔ اس محل میں رہتے ہوئے شیخ صدو ہر روز اس جن کو بُلانے لگا۔ جو بھی حکم دیتا جن اُسے پورا کر دیتا۔ شیخ صدو بہت عیش پسند انسان تھا۔ لوگوں کی بہو بیٹیوں کو اٹھوا لیتا اور اپنے محل میں منگوا لیتا۔

ہوتے ہوتے اس کی نظر راجہ کی بیٹی پر پڑی۔ شیخ سدو کا حکم سنتے ہی وہ جن جاتا اور رات کو پلنگ سمیت اس راجکماری کو اٹھا لاتا۔ سورج نکلنے سے پہلے پلنگ سمیت اس راجکماری کو واپس چھوڑ آتا۔

راجکماری اس صدمہ کی تاب نہ لا سکی اور بیمار ہو گئی۔ راجہ نے کئی حکیم بلوائے مگر راجکماری شفایاب نہ ہوئی۔ آخر کار ایک فقیر وہاں پہنچا۔ اس نے راجکماری سے تنہائی میں سارا قصہ سُنا۔ یہ فقیر دراصل وہی فقیر تھا جس نے یہ چراغ کبھی کسی کو دیا تھا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے محل کے تمام افراد کی طرف دیکھا اور ایک قوی ہیکل باندی کو اپنا ہمراز بنا لیا۔ راجکماری کے پلنگ کے نیچے ایک مضبوط لٹو باندھ کر راجکماری کے پلنگ کے نیچے سُلا دیا۔ اس کے پاس

کچھ پھول رکھ دیئے اور اُسے سمجھا دیا کہ جب یہ پلنگ اُڑنے لگے اور جب جس راستہ سے گذرنے لگے تو وہ یہ پھول ایک ایک کرکے نیچے گراتی جائے اور جب کوئی راجکماری سے باتیں کرتے ہوئے اپنے دھیان میں مگن ہو جائے تو وہ پلنگ کے نیچے سے نکل کر اس کمرہ سے باہر چلی آئے۔ ساتھ کے کمرے میں پانی کے گھڑے ہوں گے تو اُن کا پانی گرادینا۔ ادھر فقیر نے راجہ سے کہہ کر بہت سے سپاہی تیار کئے کہ جس راستہ پر انھیں پھول نظر آئیں وہ اسی راستے پر چلتے جائیں اور جا کر وہ گھر ڈھونڈلیں جہاں راجکماری ہوگی۔

اس طرح سپاہیوں نے وہ محل ڈھونڈ لیا اور محل کے دروازے کھولنے لگے۔ شیخ صدو محل کے اوپر حملہ ہوتا ہوا دیکھ کر گھبرا گیا۔ جلدی سے چراغ روشن کرکے جن کو بلوانے لگا تاکہ وہ راجکماری کا پلنگ واپس چھوڑ آئے۔ لیکن پھر اُسے یاد آیا کہ جب تک وہ نہا دھو کر کورے کپڑے نہ پہن لے تب تک وہ چراغ نہیں جلاسکتا۔ وہ تیزی سے نہانے کی خاطر گیا۔ لیکن سب برتن خالی تھے۔ اس کے محل میں کہیں بھی پانی کی ایک بوند تک نہ تھی۔ اس نے گھبرا کر نہائے بغیر ہی چراغ روشن کر دیا جن آ گیا مگر اُس نے شیخ صدو گلے سے پکڑ لیا اور ہلاک کر دیا۔"

فیض کہانی سنتے ہوئے درمیان میں ہامی بھرتا رہا تھا جب

کہانی ختم ہو گئی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اب تو سمجھ گیا کہ شیخ فدو عورتوں کے پاس کیوں جاتا ہے اس لئے کہ اُس کی پیاس بُجھی نہیں تھی۔ اس کی حسرت نہیں نکلی تھی اس لئے اس کو جب کبھی کوئی عورت بلاتی ہے تو وہ ضرور آ جاتا ہے۔"

"میں پہلے عورت لاؤں اور پھر وہ عمل پڑھوں۔ یہ سودا تو بہت مہنگا ہے۔" فیض نے قہقہہ لگایا۔

(۲)

کافی رات گئے فیض کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ فیض نے کافی دیر تک دروازہ نہ کھولا۔ اس کا ایک دوست بار بار دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اور اس کا نام لے کر آوازیں دے رہا تھا۔

"ٹھہرو یار۔" کافی دیر کے بعد فیض نے اندر سے جواب دیا۔ اس نے جب دروازہ کھولا تو اُس کا دوست اُسے دیکھتا رہ گیا۔

"یہ کیا ۔۔ ؟" دروازے میں کھڑا ہوا دوست دہلیز میں بُت بن کر رہ گیا۔ فیض نے کمر کے گرد ایک تہمد لپیٹ رکھی تھی جیسے وہ ابھی تک ہاتھ سے سنوار رہا تھا۔ اس کا باقی سارا

بدن ننگا تھا — اس پر کوئی کپڑا نہیں تھا — سر سے پاؤں تک اُس کے سارے جسم پر سیندور کے بڑے بڑے دھبے تھے۔

"کچھ نہیں یار اندر آجاؤ —" فیض بولا۔ "اُس نے دوست کو اندر بٹھا کر دروازہ بند کر دیا — اپنے حیران و ششدر دوست کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا "تم نے تو آکر سارا معاملہ چوپٹ کر دیا۔"

"لیکن تم کیا کر رہے تھے ؟" اس کا دوست اُسے ایک بار سر سے پاؤں تک دیکھتا اور پھر اُسے پاؤں سے لیکر سر تک دیکھنے لگتا

"کچھ نہیں یار۔ کسی نے ایک "عمل" بتایا تھا اور شرط یہ تھی کہ بیچ میں بولنا بالکل نہیں۔ تم آکر دروازہ کھٹکھٹانے لگے اور مجھے جواب دینا پڑا۔"

دوست اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ آخر اس نے سنجیدہ ہو کر کہا "تم یہ قلا بازیاں لگانی چھوڑو گے یا نہیں — ہر وقت تیرے سر پہ سٹہ سوار رہتا ہے۔"

"خالی الذہن ہونے سے تو یہی بہتر ہے کہ سر پر کچھ سوار رہے" فیض نے اپنے دوست کی بات مذاق میں ٹالنی چاہی۔ مگر آج اس کے دوست نے اُسے ایسا نہ کرنے دیا — "میں کروں گا تیرا بندوبست میں ساری بات طے کر چکا ہوں — بس تو تیار ہو جا۔"

"مجھے راہ پر لانا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔"

"ہاں۔ ہاں آسان نہیں اِس بات کو تو ہم جان چکے ہیں۔ جبھی تو ہم نے سارا انتظام کر لیا ہے۔"

"کِس کا انتظام؟"

"تمہیں راہ پر لانے والی کا انتظام۔"

"کہاں سے لائے ہو راتوں رات ڈھونڈ کر۔"

"دیکھو مذاق کی بات تو گئی مذاق میں۔ تم صبح کو تیار رہنا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"کہاں؟"

"جہاں میں لے چلوں۔"

"آنکھیں بند کر کے یا آنکھیں کھول کر۔" فیض ہنسنے لگا۔

"تم آنکھیں کھول کر بہت کچھ دیکھ چکے ہو۔ اب آنکھیں بند کرنی پڑیں گی۔"

"بہت اچھا اپنے ساتھ پٹی بھی لیتے آنا۔ میں آنکھیں باندھ کر تمہارے ساتھ چل پڑوں گا۔"

"بس تجھے میرے ساتھ چلنا ہے باقی ساری بات ہو چکی ہے۔ گھر بہت اچھا ہے۔ انہوں نے تیرے متعلق سب کچھ پوچھ لیا ہے۔ صرف ایک نظر تجھے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

اگلے روز فیض برابر انکار کرتا رہا۔ "بس اب زیادہ

ہاتھ پاؤں نہ مارو۔" یہ کہتا ہوا اُس کا دوست اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ راستے میں اُس نے دس روپے کی مٹھائی لے لی۔

لڑکی والوں کے گھر مردانہ بیٹھک میں فیض کو چائے پلائی گئی۔ لڑکی کی بڑی بہن ۔ ، لڑکی کی ماں کی جگہ تھی۔ وہ کچھ دیر کے بعد بیٹھک میں آگئی ۔ باتوں کے بہانے وہ فیض کی طرف دیکھتی اور اُسے پرکھتی رہی اور پھر اُس کے چہرے پر رونق آگئی

"میں اب چلتا ہوں؟" کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد فیض نے پوچھا۔

فیض کا دوست بھی اُٹھ بیٹھا۔ لیکن لڑکی والوں نے اُسے پھر بٹھالیا۔ "انہیں تو جلدی ہے مگر آپ کو تو کوئی جلدی نہیں۔ ذرا سی دیر کے بعد چلے جانا۔"

بوٹ کے تسمے باندھتے ہوئے فیض نے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہنے لگا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمہیں وہ کس لئے بٹھا رہے ہیں۔ جو کچھ پوچھیں سچ سچ بتانا۔ مبالغہ سے کام نہ لینا۔" پھر وہ لڑکی کے باپ کی طرف منہ کر کے کہنے لگا۔ "آپ اِس سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں مجھ سے پوچھ لیجئے۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔ ہمیں جو کچھ پوچھنا

پوچھ چکے ہیں۔" لڑکی کے باپ نے شرماتے ہوئے کہا۔
"پھر بھی میں آپ کو سب کچھ بتائے دیتا ہوں — اگر آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ بنک میں میرا کتنا روپیہ ہے تو میں آپ کو بتا دوں کہ میرا بنک میں کوئی حساب نہیں — میرے پاس جمع کروانے کے لئے کچھ نہیں —" فیض ہنسنے لگا اور بولا۔
"جو کچھ میرے پاس تھا میں اُسے ریس کورس میں جمع کروا چکا ہوں کسی روز میرا گھوڑا جیت گیا تو وہاں سے سارا روپیہ نکلوا لوں گا —" بیٹھک میں بیٹھے سبھی لوگ ہنس پڑے — فیض نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا — "آپ اگر یہ پوچھیں کہ میں کہاں رہتا ہوں — میں کسی کوٹھی یا بنگلے میں نہیں رہتا صرف ایک کمرہ ہے۔ اور بمبئی کی زبان میں اُسے کمرہ نہیں "کھولی" کہتے ہیں۔"
فیض ایسی باتیں کرتا اور ہنستا ہوا اپنے دوست کو وہیں چھوڑ کر لوٹ آیا۔
اگلے روز فیض یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ لڑکی والوں کے گھر سے مٹھائی کی تھالی آ گئی۔ شام کو جب فیض کا دوست آیا تو فیض شش و پنج میں مبتلا تھا کہنے لگا۔ "ایسا نظر آتا ہے کہ بات پکی ہو گئی۔"
"اور نہیں تو کیا۔ تجھے میں نے بتایا تو تھا کہ وہ

سب کچھ پوچھ چکے ہیں۔ صرف تجھے ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور کل انہوں نے تجھے دیکھ لیا۔"

"لیکن میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔"

"تو کیا دیکھے گا۔ ایک لڑکی ہے اور اچھی بھلی لڑکی ہے۔"

"نہیں یار۔ مجھے دکھا دو۔ چاہے اس کی ایک جھلک ہی دکھا دو۔"

"لڑکی دکھانے والی بات تو مشکل ہے۔ وہ تو بہت سخت پردہ"

"پھر؟"

"اچھا پوچھوں گا۔ کوئی تصویر ہو گی تو لا دوں گا۔"

"چلو تصویر ہی سہی۔ چاہے چھوٹی سی ہو"

"تصویر سے کیا پتہ چلے گا۔"

"کیوں نہیں چلے گا — میں آرٹسٹ ہوں دوست۔ انگلی برابر تصویر سے بھی سارا پتہ چلا لوں گا۔"

فیض کا دوست جوں توں کرکے ایک چھوٹی سی تصویر لے آیا۔ فیض دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اور پھر اس نے ایک آہ بھر کر سر کو جنبش دی اور کہا۔

"یہ بات نہیں بن سکے گی۔"

"کچھ پتہ تو چلے بات کیا ہے۔" فیض کا دوست پریشان نظر آنے لگا

"اس کا کوئی قصور نہیں۔ دراصل میرے ہاتھ میں شادی والی لکیر ہی نہیں ہے۔"

"فیض، اب یہ بات نہیں ہو سکتی۔ میں ضامن ہوں — انہوں نے سب باتیں طے کر لی ہیں۔ کہو کیا بات ہے۔"

"مجھے اِس تصویر میں کوئی بات ہی نظر نہیں آتی۔ شادی میں کچھ تو ہو۔"

"تمہیں کچھ ڈھونڈنا ہو تو اپنی کاغذ کی تصویر دل میں ڈھونڈ لینا — یہ بات اب ٹل نہیں سکتی۔"

"بہت اچھا۔ یوں ہی سہی مگر ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"مجھ سے بعد میں شکوہ نہ کرنا کہ رات کو فیض گھر نہ آیا۔ یا گھر میں آنا نہیں تھا۔ اس نے لاکر نہ دیا —" فیض کا دوست طرح گیا اور کہنے لگا۔ "اگر تیری مرضی نہیں ہے تو نہ سہی۔ انہیں لڑکی کو کنوئیں میں تو نہیں پھینکنا۔"

اس کا دوست چلا گیا — آج فیض کو اپنی ماں یاد آ گئی تھی — سادہ خدوخال والی عورت — اُسے آج کی لڑکی کی تصویر یاد آ گئی — جس کے خدوخال میں کوئی چیز بھی تو چمک نہیں رہی تھی اُس کی ماں ایک نیک عورت تھی۔ لیکن اس کے دامن میں تمام عمر ناانصافی پڑی رہی — یہ لڑکی بھی پاک دامن ہو گی اور میں

نے اگر اس کے ساتھ شادی کر لی تو میں بھی اس کے ساتھ ناانصافی کروں گا۔ فیض نے سوچا اور اس نے فیصلہ کر لیا۔ "میں اس کے ساتھ بیاہ نہیں کروں گا میں اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کرونگا۔"

(۳۳)

پڑوسیوں کے گھر میں ایک مراٹھن کو جھاڑو دیتا دیکھ کر فیض کو ایک بات سوجھی۔ اس نے مراٹھن کو آواز دی۔ "یہ میرا کمرہ صاف کر دے۔ کیا تمہیں دو گھنٹے کی فرصت ہے؟"

فیض نے پوچھا اور پھر اپنے کمرے کی طرف دیکھا شیشیاں ڈبے، کاغذ، گتے ــ پھٹے پرانے ــ الم غلّم ــ نہ جانے یہ تمام چیزیں کتنے برسوں کی گرد اپنے سینے سے لگائے ہوئے پڑی تھیں ــ فیض نے مراٹھن بائی کی طرف دیکھا اور کہا "دو روپے دوں گا۔"

بائی نے جھاڑو اٹھایا مگر دوبارہ ایک طرف رکھ دیا پہلے کمرے کی تمام چیزیں باہر نکالتی ہوں گی ــ یہ دری بھی تو اٹھانی ہوگی۔ وعدہ کے مطابق دو گھنٹے تو چھوٹی چھوٹی چیزیں اٹھانے میں ہی گذر گئے اور جب بائی نے دری کا فرش اٹھا کر فرش

مٹی دیکھی تو ہنس کر بولی۔ "صاحب کتنے برسوں کے بعد کمرہ صاف کروا رہے ہو!۔"

فیض بھی ہنس پڑا اور انگلیوں پر کچھ گننے لگا۔ "شاید سات برس کے بعد" "سات برس۔" بائی کے چہرے پر ایک تہہ خاک کی دوسری حیرانی کی بہت سے کمروں والی اس عمارت کے دروازے کے آگے کوڑا پھینکنے کے لئے ایک بہت بڑا لوہے کا ڈول پڑا ہوا تھا۔ وہ جب مٹی سے بھر گیا تو بائی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "یہ باقی مٹی کہاں پھینکوں صاحب؟"

بازار کے کسی دوسرے ڈول میں مٹی پھینک کر بائی نے جب ساری چیزیں قرینے سے رکھ دیں تو فیض نے دو روپوں کی بجائے پانچ روپے بائی کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور بولا۔ "دراصل مجھے تم سے ایک کام اور بھی ہے۔"

بائی نے گھبرا کر فیض کے منہ کی طرف دیکھا۔

فیض مسکرایا اور بولا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تجھے دو چار لفظ سکھائے دیتا ہوں۔ رات کو سونے سے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے تم انھیں پڑھتی رہنا اور پڑھتے پڑھتے سو جانا خواب میں ایک شخص آئے گا تو اس سے سٹے کا نمبر پوچھنا۔ وہ جو نمبر بتائے اسے تو یاد رکھنا۔ کل میں تجھے پانچ روپے اور دوں گا۔"

کافی دیر تک بائی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ بس اتنی سی بات سمجھ میں آئی کہ آج اسے پانچ روپے مل گئے تھے اور کل بھی اسے پانچ روپے

نہیں گے۔ پھر فیض نے دھیرے دھیرے بابی کو ساری بات سمجھا دی اور وہ سطریں بھی اسے یاد کروا دیں۔

"رمک کے ہو شہزادے ہو۔ چلو جھکری آہ گھکری۔

ترنگہ نام دھراتے ہو۔ شیخ عبدو۔

کل کے کئے سٹے کا ممبر بناؤ۔ حشر میں دامن گیر ہوں گا۔!"

اگلے روز کی صبح کا فیض بڑی بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ صبح ہوئی اور بابی بھی آگئی۔

"صاحب وہ منتر رات گئے تک پڑھتی رہی"

"پھر" فیض نے بتری سے پوچھا۔

"پھر میں نے یہ خواب دیکھا کہ کوئی شخص میری کھولی میں آ کر میری چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھ گیا ہے"

"کیا تو نے اس سے کچھ پوچھا۔" فیض کا سانس پھول رہا تھا۔

"میں نے یہ تو نہیں پوچھا۔ صرف یہ سوال کیا کہ تو کون ہے۔ وہ کہنے لگا شیخ عبدو۔"

"تو شیخ عبدو آگیا؟" اور فیض کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"میں نے اس سے کہا تو پرایا مرد ہے۔ میری چارپائی پر کیوں آ بیٹھا ہے۔ یہ سن کر وہ چلا گیا۔

"بہت۔ تیرے کی۔" فیض نے اپنا سر پیٹ لیا۔

(۴۳)

بند دروازے کو ہاتھ سے کھول کر فیض کا دوست امرا بھی دہلیز میں

تھا کہ وہ پکڑے ہوئے اخبار کو پرچم کی طرح لہرا کر بولا۔ "تم نے تو کمال کر دیا فیض۔"

مستفسرانہ نگاہوں سے فیض نے اس کے منھ کی طرف دیکھا۔ "میں نے کیا کمال کر دیا۔ اندر تو آجا۔"

فیض کا دوست فیض سے بغلگیر ہو گیا اور کہنے لگا۔ "فلمی دنیا میں تمہارا نام ہمیشہ زندہ رہے گا" اور اس نے اخبار "اسکرین" کا ایک صفحہ کھول کر اس کے آگے کر دیا۔

"اچھا تو چھپ گیا۔" فیض نے غور سے دیکھا اور کہا۔ "اچھا چھپا ہے"

"آج تک کسی نے "لے آؤٹ" میں فلمی اسکیچ نہیں دیا تھا۔ تمام آرٹسٹ فوٹو کو جوڑ کر ہی "لے آؤٹ" بناتے تھے۔ اس کی ابتداء تم نے کی ہے فیض اور صرف تم نے کی ہے۔"

فیض کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور پھر اس نے بڑے انکسار کے ساتھ اپنے دوست کی قدر شناسی کا شکریہ ادا کیا۔

"یہ کہنے کی بات نہیں فیض۔ تجھ جیسی لکیریں کوئی نہیں لگا سکتا۔"

"یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے میرے دوست۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ ابھی میں کر نہیں رہا ہوں۔ یا یوں کہوں کہ وہ ابھی مجھ سے ہو نہیں رہا۔" فیض سوچ میں ڈوب گیا۔

"تم کیا چاہتے ہو۔"

"میں۔" فیض نے اپنے ماتھے کو اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں میں لے کر دبایا "میں اپنے پیچھے کوئی بہت بڑی چیز چھوڑ جانا چاہتا ہوں۔ اس چیز کے لئے میرے سینے میں بہت کچھ ابل رہا ہے۔......"

امر نے اپنی آنکھیں فیض کے چہرے پر گاڑ دی تھیں۔ فیض نے اپنے دل کی بات کہدی۔ "میں راگ پینٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"راگ؟"

"اس طرح نہیں جس طرح لوگ ماضی میں انھیں پینٹ کرتے آئے ہیں۔ میں ایک ایک راگ کو ایسی صورت دینا چاہتا ہوں کہ جو وجد اس راگ کو سن کر ہمارے دل پر طاری ہو جاتا ہے وہی وجد اس صورت کو دیکھ کر بھی طاری ہو جائے۔ مثلاً بھیرول راگ ہے۔ صبح کا وقت۔ دل کا سکون۔ عبادت کا عالم۔ میں اس طرح سوچتا ہوں....." فیض نے اپنے دوست کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں۔

دوست کی آنکھیں اس کے ایک ایک لفظ کو اپنے اندر جذب کر رہی تھیں۔ فیض نے کہا۔ "ایک راگ میں ایک بار بڑے غلام علی خاں سے سنوں اور پھر اسی راگ کو میں ایک بار امیر خاں سے سنوں۔ پھر اسی راگ کو ایک بار سجاد حسین سے سنوں۔ اور پھر دیکھوں کہ میرے دل کی جو حالت ایک بار ہوتی ہے کیا وہ دوسری بار بھی ہوتی ہے؟ کیا وہی تیسری بار بھی ہوتی ہے۔ اور پھر میں اس میں سے ایک نتیجہ برآمد کروں اور جو نتیجہ برآمد ہو اسے کاغذ پر رنگوں سے پینٹ کر دوں۔"

"تو جو کچھ سوچا ہے اگر کبھی تو اسے کر پائے......"

"یہی تو میں بھی سوچتا ہوں کہ اگر میں اسے کبھی کر پاؤں....."

---

(۱)

حیدرآباد کے اسٹیشن پر فیض کے دوست نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ایک بہت اچھے ہوٹل میں اس نے فیض کے لئے کمرہ لے لیا تھا۔

"ریس تو کل ہوگی۔ آج کے دن فرصت ہے۔" فیض نے کمرے میں سامان رکھ کر چائے کی پیالی پیتے ہوئے کہا۔

"کہیں تفریح کے لئے چلیں۔"

"ضرور۔"

"یہاں دو بہنیں ہیں جو بہت اچھا گاتی ہیں۔"

"سچ۔ تو چلو ابھی چلو۔"

"اس گھڑی تو دوپہر ہے۔ گانے بجانے کا وقت شام کا ہوتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں دوست۔ ہمیں کہاں جانا پڑے گا؟"

"محبوب کی مہندی۔"

فیض اور اس کا دوست جب اس بستی میں پہنچے تو گلیوں کے گیت اور سازوں کے سُر وا تھی سو رہے تھے۔ بیٹھک کھلی تھی۔ ایک طرف کچھ ساز پڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف دونوں بہنیں (جن کی شہرت سُن کر فیض شام کا انتظار نہ کر سکا تھا) ایک دیوان پر کچھ تھکی تھکی سی بیٹھی تھیں۔ چار برس کی ایک بچی اُن کے قریب کھیل رہی تھی۔

فیض اور اس کا دوست اس بچی سے باتیں کرتے، اُسے ہنساتے، خود ہنستے کچھ سنانے کی فرمائش کرنے لگے۔ بچی نے توتلی زبان میں دو تین فلمی

گیت سنائے۔ گیت بھی مکمل نہیں تھے۔ لیکن ورثہ میں سُر اُسے ملا ہوا تھا۔
فیض نے بچی کو پیار کیا اور پچیس تیس روپے اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور پھر بیکار بیٹھے ہوئے فیض سے اس کے دوست نے کہا "تم ہی کچھ گا کر سناؤ"

"ہاں۔ ہاں ضرور گایئے۔" دور بیٹھی ہوئی بہنوں نے کہا اور انگڑائی لے کر تھکن دور کی۔ شاید وہ سوچ رہی تھیں۔ "اچھا ہے اگر خود ہی گا اور بجا لیں۔ ورنہ اِس دوپہر کو ہم سے کچھ فرمائش کر بیٹھیں گے۔"
"کوئی سارنگی بجانے والا۔" فیض نے اِدھر اُدھر دیکھا۔
"جاؤ بیٹی بھیّا کو بلا لاؤ۔" ایک بہن نے اُس بچی سے کہا۔
بھیّا نے آتے ہی سارنگی پر گز پھیرا۔ فیض نے راگ بھیم پلاسی چھیڑ دیا۔ مکھڑا تھا۔ "ہے بیرا با ہمنا!" فیض نے ابھی دو ہی بار یہ بول الاپا تھا۔ کہ دونوں بہنیں دیوان پر سے اُٹھ بیٹھیں۔ فیض کے سامنے آکر بیٹھتے ہوئے انہوں نے ایک ساتھ کہا۔ "اتنے دنوں کے بعد ایسے سُر کانوں میں پڑے ہیں"
"طبلے والے کو بلا لاؤ۔" ایک بہن نے کہا۔ جس طرح ایک مور کو ناچتے دیکھ کر دوسرے مور کے پنکھ جھوم اُٹھتے ہیں۔
کچھ دیر کے بعد فیض نے غالب کی غزل چھیڑ دی۔ "نکتہ چیں ہے غم دل......" ایک مصرع ایک بہن نے اُٹھایا اور دوسرا مصرع دوسری بہن نے۔

ایک ہی غزل تین گلوں میں نغمہ ریز ہوئی۔ ایک غزل۔ دوسری غزل۔ تیسری غزل اور پھر شام ہو گئی۔
"پرسوں آپ کی دعوت ہے ہمارے یہاں۔" اُٹھ کر جاتے

ہوئے فیض سے دونوں بہنوں نے بڑے احترام سے کہا۔
"پرسوں ــــ پرسوں تک نہ جانے میں کس حال میں ہوں گا۔"
فیض نے کہا۔
"کیوں؟"
"کل میں ریس کھیل رہا ہوں ــــ اگر میں جیت گیا تو پرسوں ضرور آؤں گا۔"
"نہیں تو۔"
"پھر۔ پھر اللہ مالک ہے۔"
دونوں بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں ــــ وہ تاکید کرنے لگیں۔
"نہیں، نہیں۔ ضرور آیئے گا ــــ ہمارے کان بھی اصل راگ کے لئے ترستے رہتے ہیں۔"
"تکلف نہ کیجئے گا ــــ اگر میں آگیا تو جو کچھ پکا ہوا ہوگا کھا لوں گا۔"
دوسرے دن فیض ہار گیا ــــ بہت سا روپیہ ہار گیا۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔
"اب کے میں روپے ہی نہیں ہارا بلکہ ایک دعوت بھی ہار گیا ہوں میں نغمہ و سرود کی محفل بھی ہار گیا ہوں۔"

(۲)

فرحا کا بیاہ اس کی ذات برادری میں کہیں ہوگیا۔ اس شادی

نے فیض اور فرحا کی دوستی کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں ڈالی تھی۔ اس دوستی نے کبھی شادی کے راستے پر چلنا نہیں چاہا تھا۔ اس لئے اس کا ماتھا اور بھی چمک اٹھا تھا۔

آج فرحا میکے آئی ہوئی تھی۔ فیض سے ملنے ماں کے ساتھ آگئی۔

اُسے بیٹھے ہوئے بہت دیر ہوگئی۔ فیض کا سب سے عزیز دوست ایم صادق وہاں آگیا۔

"آج چاہے تم کتنا ہی کیوں نہ ہنستے رہو۔ تمہاری اُداسی چھپ نہیں رہی ہے۔ کیا بات ہے۔" صادق نے تھوڑی دیر کے بعد کہا

فیض نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ فرحا بولی۔ "آج اس کو بہت مار پڑی ہے۔"

"ہار گیا ہوگا؟"

"ہاں ریس میں"

"کتنے روپے۔"

"پاس ہوں تو میں سینکڑوں روپوں کو بھی گنتی میں نہیں لاتا۔ آج میرے پاس کچھ نہیں۔ آج زبانی ہی کھیلتا رہا ہوں اور اب مجھ پیسے لینے آرہا ہوگا۔"

"تم اپنی جیب تو ٹٹول چکے ہو، کبھی دوستوں کا دل ٹٹول لیا کرو۔" صادق نے بڑے سکون سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تجھے یاد نہیں — ہمارا سیف سا تھا ہے۔ جس طرح میں



Scanned by CamScanner

اُسے کھول سکتا ہوں، تم بھی کھول سکتے ہو۔"

"مگر۔"

"کبھی اس "مگر" کو بھول بھی جایا کرو۔"

پاس بیٹھی فرحا نے شکایت کے انداز میں فیض سے کہا۔ "تم نے مجھے لنگی والی بات تو بتائی ہی نہیں تھی فیض!" وہ سوچ رہی تھی فیض نے اپنی جس پریشانی کا ذکر صادق سے کیا اُس سے کیوں نہ کیا۔ کیا وہ صادق کو اس سے زیادہ دوست سمجھتا تھا۔ فیض لاکھ شبہ کرتا مگر اس کی یہ دونوں دوستیاں دن کی روشنی کی طرح تھیں۔ دروازے بند کر دینے پر بھی اِس دوستی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"اُٹھ اور جا کر سیف میں سے روپے نکال لا" صادق بولا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ پانچ بج کر بیس منٹ ہو گئے ہیں۔ تیرے وہاں پہنچتے سیف بند تو نہیں ہو جائے گی۔؟ ساڑھے پانچ بجے بند ہو جاتی ہے۔

فرحا نے لپک کر اپنی الماری کی چابی فیض کے ہاتھ میں دیدی۔ "یہی الماری ہے جس میں سے تم نے اپنے ہاتھوں سے کئی بار کچھ رکھا ہے اور کئی بار کچھ نکالا ہے۔"

"جا جا کر لے آ اور صبح کو سیف میں سے نکلوا کر واپس کر دینا" صادق بولا۔

فرحا کی تھوڑی چیزیں گو سسرال میں تھیں لیکن ماں کے گھر کی الماری میں اس کا کچھ حصّہ تھا۔ گھر پڑوس ہی میں تھا۔ فرحا اور اس کی ماں وہیں

بیٹھی رہیں - فیض چابی لیکر چلا گیا اور اپنی ضرورت کے مطابق روپے وہاں سے نکال لایا -

فیض کے آتے آتے فرحا نے اس کے کمرے میں انگیٹھی پر چائے رکھدی تھی - فیض نے ٹیکی کو پیسے دے دیئے اور چائے کی پیالی فرحا کے ہاتھ سے لے لی -

فیض کے دل میں بہت سے دلائل کھٹکنے لگے - "میں ان کا مقروض ہوں - اِن دوستوں کا - جو منھ سے کچھ بھی نہیں کہتے - اُن کی جیب کے قرضہ سے تو میں نپٹ لوں گا - لیکن ان کے دلوں کا قرضہ کیسے ......"

وہ اس سوچ کا تانا بانا بُنتا رہا - کنوئیں کے مالی کی طرح - جس کے ڈول کبھی ڈوب جاتے اور کبھی بھر جاتے - پھر فیض نے اُن میں چلو بھر لیا - "اب میں کبھی سٹہ نہیں کھیلوں گا - اب میں کبھی ریس کورس نہیں جاؤں گا -"

فیض کا جی چاہا کہ آج وہ یہ بات اپنے منھ سے نکال دے - "نہیں نہیں - نہیں - یہ بات نہیں کہوں گا - یہ بات تو مجھے اپنے دل میں اُتارنی ہے - دل کی گہرائیوں میں -" فیض سوچنے لگا اور پھر وہ خاموشی سے اِس بات کو چائے کے گھونٹ سے اپنے دل میں اُتارنے لگا -

(۳)

فیض ہمیشہ کسی نہ کسی آتے جاتے شخص کے ہاتھ روپے، کپڑے اور دیگر چیزیں اپنے باپ کو بھجوایا کرتا تھا - لیکن وہ باقاعدگی سے ایسا نہیں کیا کرتا تھا -

کبھی کبھی اُس کے والد اُسے ہلکی سی چیتاوٗنی دیا کرتے تھے کہ میں تجھے تیرے فرض سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ پچھلی بار جب اُن کا ایسا خط آیا تھا تو نیفی نے طعن آمیز انداز میں انہیں یہ لکھ دیا تھا کہ انھوں نے خود اپنی بیوی اور اپنے چھوٹے معصوم بچوں کے ساتھ کون سا فرض نباہا تھا جو آج وہ دوسروں کو فرض سے آگاہ کر رہے تھے۔

آج نیفی کو اُن کا بہت تکلیف دہ خط موصول ہوا کہ وہ اپنی بیوی کی کیا مدد کرتے۔ ان کی بیوی نے تو دوسروں کے کپڑے سی کر اور دوسروں کے گھروں میں برتن صاف کر کے اُنہیں بدنام کیا تھا۔ نیفی کے دل میں رُکا ہوا سیلاب اس کی قلم کی سیاہی سے اُبل پڑا۔ "آپ ایک ادیب ہیں اور میں آپ کے سامنے نہایت ہی حقیر انسان ہوں۔ لوگ آپ کے قلم کا لوہا مانتے ہیں۔ ...... لیکن کیا آپ میری ایک بات کا جواب دے سکیں گے؟ میری ماں لوگوں کے کپڑے سیتی رہی، لوگوں کے برتن صاف کرتی رہی کڑی محنت کر کے آپ کے بچوں کی پرورش کرتی رہی اور آپ کہتے ہیں کہ اُس نے آپ کو بدنام کیا۔ اگر میری ماں یہ کچھ نہ کرتی اور کسی بازار میں بیٹھ جاتی تو کیا آپ اسے اچھا سمجھتے۔

"حضرت عمر بادشاہ تھے لیکن راستے میں چلتے ہوئے وہ بڈھوں کے سروں پر سے بورے اُتروا کر خود اُٹھا لیا کرتے تھے۔ کیا وہ بادشاہت کی توہین تھی یا اورنگ زیب کے پاس دولت کی کمی تھی۔ لیکن وہ کتابت کیا کرتا تھا اور جو پیسے وہ اپنے ہاتھ کی محنت سے کماتا تھا۔ بس انہی پیسوں کی روٹی کھایا کرتا تھا۔ کیا اس کے ہاتھوں کی محنت اس کے تاج کو بدنام کرتی تھی۔"

نیفی نے ایک طویل خط لکھا اور پھر اسے ڈاک کے سپرد کر دیا۔

سامنے سڑک پر لینا آ رہی تھی ۔۔ اس کے ساتھ کوئی مرد تھا۔

وہ ہنس رہی تھی اور جھوم رہی تھی ۔۔ اس کی نظر فیض پر پڑی۔ اس کی ہنسی اور بھی بلند ہوگئی ۔۔ اس نے دائیں ہاتھ کو ہلا کر فیض سے کہا "ہیلو"

فیض کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے لیسا کوئلہ تھی۔ زمانے کی ہوا نے اُسے اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ اور اس نے آج اپنے چہرے اور اپنے بدن پر سے راکھ جھاڑ کر اس کی طرف پھینک دی تھی۔ "ہیلو۔"

فیض نے منہ پھیر لیا۔ سامنے چوک میں بائیں طرف لگے ہوئے لیٹر بکس میں چٹھی ڈال دی اور اُلٹے پاؤں گھر لوٹ آیا۔

گھر آیا تو اس کے کمرے کے آگے ایک یہودی لڑکی کا چھوٹا بھائی اس کی چٹھی لئے ہوئے کھڑا تھا۔ فیض نے اس بچّے کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور وہ خط پڑھا۔

یہ لڑکی فیض کو پہلے بھی کبھی کبھی خط لکھا کرتی تھی۔ وہ خط سادہ ہوتا تھا جس میں وہ فیض کو اس کے اچھے سلوک کا شکریہ ادا کرتی تھی۔ آج اس نے اپنے خط میں محبت کا اظہار کیا تھا اور اپنی ایک بہت اچھی تصویر بھجوائی تھی۔ دراصل اس لڑکی کے ساتھ پچھلے دنوں ایک اندوہناک حادثہ ہوا تھا محلّے کے ایک شخص نے اُس سے دست درازی کیا تھا اور وہ لڑکی بہت دکھی تھی ۔۔ اس محلّے میں بھی وہی بات ہوئی تھی جو ہر جگہ ہوتی ہے ۔۔ لوگوں نے مرد کی گستاخی کو تو معاف کر دیا تھا۔ لیکن انہوں نے لڑکی کی بے بسی کو معاف نہیں کیا تھا۔ وہ جدھر سے گذرتی تھی کہ کوئی نہ کوئی شخص اس پر اُنگلی اٹھاتے ہوئے ہنس پڑتا تھا ۔۔ کوئی دوسرا شخص اُسے دیکھ کر اپنے ساتھی سے کانا پھوسی کرنے لگتا تھا ۔۔ وہ لڑکی اس طنز کی ستائی سر جھکا کر چلا کرتی تھی۔

فیض کے دل میں اس لڑکی کے لئے ہمدردی کا جذبہ قدرتی طور پر پیدا

ہوا تھا ۔ اس نے لوگوں کو شرارت سے باز رکھا اور اس طرح سے
اس لڑکی کا بازار میں نکلنا آسان ہو گیا ۔ فیض کے اچھے سلوک کا شکریہ
ادا کرتے ہوئے اس لڑکی نے اپنے خط میں محبت کا اقبال کیا تھا اور اس
نے اپنی ایک تصویر بھیجی تھی ۔ فیض تھوڑی دیر تک تصویر کی طرف دیکھتا
رہا اور پھر اس نے کاغذ قلم لے کر یہ سطور لکھیں — "ہماری جان پہچان
جس مقام پر ہوئی وہ انسانی ہمدردی کا مقام تھا ۔ یہاں قدموں تلے
محبت کی زمین نہیں ہے ۔ اگر میں نے ہمدردی کو رشتے کا روپ دیدیا
تو تم سے یہ بہت بڑی نا انصافی ہوگی ۔ میری دعا ہے کہ تمہیں زندگی میں
محبت ملے اور انصاف ملے ۔ میرے نام یہ تمہارا خط اور یہ تمہاری
تصویر تمہیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ کردے اس لئے یہ تمہیں لوٹا رہا
ہوں ۔"

فیض نے یہ تمام چیزیں ایک لفافہ میں بند کیں اور اس چھوٹے
بچے کے ہاتھ واپس بھجوا دیں ۔

( ۴ )

کسی غیبی طاقت نے فیض کے دل کا ساز اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ۔
اس ساز کا کوئی تار زنگ آلود تھا اور کوئی تار ٹوٹ گیا تھا ۔ اُس
نے تمام پرانے تار اُتار دیئے اور اس کے سریلی والی چابیاں کس دیں ۔
اور پھر اُسے سُر کیا اور اپنی پتلی پتلی سندر انگلیوں سے وہ تار چھیڑ دیئے

وہ طاقت کبھی کوئی راگ چھیڑتی اور کبھی کوئی راگ۔
اور پھر فیض کے کانوں میں اپنے پیارے دوست رفیق غزنوی کے یہ بول پڑے۔

رین کا سپنا۔کس سے کہوں پکار۔ رین کا سپنا
سوت سووت جاگ اُٹھے جب کوئی نہ پائیوا اپنا
رین کا سپنا .....

فیض کے قدم خود بخود امیر خاں کے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے
"میں راگ پینٹ کرنا چاہتا ہوں — آپ راگ چھیڑیں۔ کوئی راگ چھیڑ دیجئے۔"
دھنوں کے ساگر میں فیض کا دل آج کنول کے پھول کی طرح کھِل اُٹھا وہ شام کو سجاد حسین کے گھر چلا گیا۔
"آپ راگ چھیڑیں — کوئی راگ چھیڑ دیجئے۔"
آج فیض کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے، کئی برسوں سے اور کئی صدیوں سے ایک ریگستان سے گزرتا آ رہا تھا اور آج اس کے قدم اچانک ایک رنگین وادی میں داخل ہو گئے تھے۔ قدموں تلے مخمل جیسی گھاس تھا۔ سر کے اوپر رنگین پھولوں والے سبز پتے جھوم رہے تھے اور سامنے ٹھنڈے پانی کے چشمے بہہ رہے تھے۔
اپنے کمرے کے میز پر پڑی ہوئی رنگوں کی شیشیاں سنوارتے ہوئے اس نے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے ہوئے دیکھے۔
اس نے ایک کاغذ کھولا جس پر لکھا تھا۔
"ہنومان کا علم — ہنومان ہٹیلا۔ لوہے کی سلاخ، بزرگی کا

قلعہ۔ ساٹھ تیلیاں سینچو۔ رنگ کوٹ کا تھان۔ دوڑ سٹہ بازار کی اور اوپن کلوز کی خبر لا۔"

بنیض نے دوسرا کاغذ اٹھایا۔ کھولا۔ لکھا ہوا تھا۔

"کالی کا عمل ۔ کالی دیہا کالی ۔ برہما کی بیٹی ۔ اندر کی سالی کالی کلکتہ والی ۔ تیرا وچن نہ جائے خالی ۔ سٹہ کا نمبر دے کر جائے تو کالی کلکتے والی کہلائے۔"

فیض نے پھر تیسرا کاغذ، چوتھا کاغذ اور کئی دوسرے کاغذ کھولے سارے کاغذ اکھٹے کر کے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لئے اور پھر سے توڑے مروڑے ہوئے کاغذوں سے بھری مٹھی کی طرف دیکھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دیوار پر کھڑا تھا۔ سامنے دو سڑکیں تھیں۔ دونوں سڑکیں اُسے دعوت دے رہی تھیں ایک سڑک پر بہت روشنی تھی۔ رنگ برنگے پھولوں والے اسکرٹ پہن کر کچھ گوری اور سفید یہودی لڑکیاں چلی جا رہی تھیں ۔۔ دور کچھ مردوں کا ہجوم تھا۔ کسی کی آواز آ رہی تھی۔ "اوپننگ تین ۔ کلوزنگ پانچ ۔" اور کچھ لوگ اپنی مٹھیوں میں کچھ نوٹ اچھال رہے تھے ۔ دور بہت دور چمکتے ہوئے گھوڑے چہل قدمی کر رہے تھے۔

دوسری سڑک پر اندھیرا تھا۔ دور تک پھیلا ہوا گہرا اندھیرا تھا ایک گہرا سکوت۔

بنیض نے گھور کر دیکھا ۔ دور بہت دور ایک چیز چمک رہی تھی۔ فیض کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک نظر پھیلتی گئی۔ کچھ بھی پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ کوئی چیز تھی اور کبھی کبھی بڑی تیزی سے چمک اٹھتی تھی اور پھر اس میں کئی رنگ جھلملانے لگے۔ کبھی کوئی رنگ جھلملاتا اور کبھی

کوئی زنگ ہے۔ پھر فیض کے کانوں میں ایک جھنکار پڑی۔ اندھیرے
کی گود میں ہلکے ہلکے اور میٹھے میٹھے سُر بیدار ہو رہے تھے۔
فیض نے پہلی سڑک کی طرف دیکھا اور پھر دوسری سڑک کی طرف
پھر پہلی سڑک کی طرف اور پھر دوسری سڑک کی طرف۔
یہودی لڑکیاں مسکرا اُٹھیں۔ اندھیرے کی گود میں سُر بلند ہو گئے
بہت سے نوٹ کھڑکھڑائے۔ بہت سے زنگوں کی صورتیں چمک
اُٹھیں۔
فیض نے اپنے قدموں کی طرف سر جھکا کر دیکھا۔ اس کا ایک
پاؤں دوسرے پاؤں پر تھا۔ اُس نے اپنا سر اُٹھایا۔ ایک نظر
دونوں سڑکوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر پاگلوں کی طرح اِس تاریک سڑک
پر دوڑنے لگا۔ جہاں دور ......... دور کوئی چیز چمک رہی
تھی۔

امرتا پریتم
سرزمین پنجاب کی مشہور اور مقبول شاعرہ جس پر
پنجابی ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے، ایک کامیاب
ناول نگار بھی ہے۔ ادبی خدمات کیلئے انہیں ساہتیہ
اکادمی اور پنجاب سرکار کیطرف سے اعزاز بھی ملے
ہیں اور قارئین کی طرف سے خطوط کے ڈھیر۔ انکی
کئی تصانیف تو ہندی اردو کے ساتھ ساتھ کئی دوسری
ملکی و غیر ملکی زبانوں میں بھی چھپی ہیں
"دو آوازیں" انکی تازہ ترین تخلیق ہے جسمیں انہوں نے
ایک آرٹسٹ کی زندگی کو اپنے الفاظ میں ایک ورزندگی
دی ہے !!!
ستار پاکٹ بک سیریز، ۲-۱۵، دریا گنج، دہلی